انگور

قیمت ۸ر

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

گہوارۂ تمدن

مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اسکی زبان اسکی تخیل، اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و بیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہ اپنی سے پہلی کتاب ہے جس موضوع پر لکھی گئی ہے اور بلندی کلام کے لحاظ سے ایسی نظر آتی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات جمع کر دئے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں سیر الصحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول عہ

نقاب اٹھ جانیکے بعد

تین افسانوں کا مجموعہ جنمیں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں۔ زبان و بلاغت انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵ر علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہگئی ہیں۔ قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ چند گمنام فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۲۔ ادیئن کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ

سلطنت کامل پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جسنے سب سے پہلے ترکی و مصر، عرب و حجاز میں انقلاب کی رو چلا دی قیمت عہ علاوہ محصول

تذکرۂ خندۂ گل

مولفہ عبد الباری آسی جس میں ۳۰ صفحات سے زاید اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف و انتخاب کلام کے درج ہیں قیمت سو محصول عہ

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

مثنوی لالہ رخ

طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ، ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت سہ محصول عہ

مثنوی زہر عشق

مرتبہ مجنوں گورکھپوری جسمیں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں یک تصویر رنگین ہے۔ عہ

فراست التحریر مکمل

یعنی اعداد و اکبر بری رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸ر علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (ے،)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵	فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۳۴ء	شمارہ ۲

۲ ملاحظات
۹ زبان اُردو کے ارتقائی منازل ——— عبدالمالک
۲۰ حُسن وعشق کی کشاکش ——— محمد اسحاق
۲۶ انگریزوں کی آئینی آزادی ——— ڈاکٹر۔ اس۔ ان۔ جعفری بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا
۳۱ تاریخ ہند کا ایک ورق ——— مشیر احمد علوی بی۔ اے
۴۵ وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے ——— قاضی محمد عزیز عرفانی
۵۳ مکتوبات نیاز
۵۹ باب الانتقاد
۶۸ باب المراسلۃ والمناظرہ
۷۱ باب الاستفسار
۷۴ کسان (نظم) ——— عسلی اختر
۷۸ معلومات

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	فروری ۱۹۳۴ء	شمارہ ۲

ملاحظات

ماطفلِ کم سواد و سبق قصّہ ہائے دوست
صد بار گفتہ و دگر از سر گرفتہ ایم

احتسابِ نفس ——

جب غور کرتا ہوں کہ گزشتہ بارہ سال کے زمانہ میں جو نگار کی معیت میں بسر ہوا ہے، میں نے کیا کیا تو ایک طرف اپنی مساعی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

انچہ در مبدء فیاض بُود آنِ من ست

لیکن جب دوسری طرف شاہدِ مقصود کا خیال آتا ہے تو بے اختیار بیدلؔ کے یہ اشعار زبان پر آجاتے ہیں :-

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست　　چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجاست
دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم　　کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

کہا جاتا ہے کہ دُنیا میں انسانی کوششوں کی حالت بالکل اُس خس وخاشاک کے اضطراب کی سی ہے جو طوفانی دریا کی پُرخروش موجوں پر بہلا چلا جا رہا ہو اور وہ کسی ایک جگہ ٹھیر کر سیلاب کی رفتار کا اندازہ کرنا چاہے۔ ہم سے سوال ہوتا ہے کہ کیا برف کا ڈھیلا جو ہر آن گھلتا جا رہا ہے کوئی تعین اپنے وزن کی کر سکتا ہے۔ کیا بگولہ جو ریگستان میں ایک عفریت کی طرح دوڑتا نظر آتا ہے، اُن ذرات کے رقص کے علاوہ کچھ اور چیز ہے جو صرف پامالی وانتشار ہی کے لئے وضع ہوئے ہیں۔ یعنی

اگر ایں ست گلِ تازہ کہ تو داری نیست
بلبلاں را زپر و بال گراں تر قفسے

دُور افق میں ایک سبز و شاداب پہاڑی کی رنگینیاں بے اختیار دل کو کھینچ رہی ہیں، قدم بے مضطربانہ اُٹھتے ہیں، لیکن شب و روز کی سعی کے بعد جب ایک صبح وہاں ہم تھکے ہوئے پہونچتے ہیں تو دفعتہً وہ پردۂ رنگین غائب ہو جاتا ہے اور بجائے ایک گلپوش قطعۂ زمین کے ایک بے آب و رنگ ڈھیر پتھروں کا نظر آتا ہے۔ گرم ریگستان کی شدید گرمی میں حدِ نظر پر ایک حوض پانی سے لبریز دھوپ میں چمکتا ہوا نگاہوں کے سامنے آتا ہے، ہم اپنی تشنگی بُجھانے کے لئے بیتابانہ اس طرف دوڑ پڑتے ہیں، لیکن جس وقت وہاں پہونچتے ہیں تو پانی کا چشمہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور ہم اسی جگہ تڑپ کر گر پڑتے ہیں۔

برسات کی تاریک، بھیانک رات میں جبکہ نشانِ راہ معدوم ہو کر ہمارے لئے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی، دور ایک چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیتا ہے، ہم پانی سے تر بتر کانپتے ہوئے وہاں پہونچتے ہیں، لیکن نہ وہاں کوئی چراغ موجود ہوتا ہے نہ کسی کسان کا جھونپڑا، دفعتہً بجلی کی چمک میں چاروں طرف پانی کی موجیں نظر آتی ہیں اور ہم مایوسانہ اسی جگہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات وحوادث ہمارے سامنے پیش کر کے ہماری ہمتوں کو ضعیف اور ہماری کوششوں کو ناکارہ بنانے کی سعی کی جاتی ہے، پھر ایک ایسا انسان جو ان ناکامیوں کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں ہوتا، یا تو فنا ہو جاتا ہے یا اگر اس میں تھوڑی سی کیفیت خودداری کی ہوتی ہے تو وہ ایک خاص نظریہ قایم کرتا ہے اور فطرت سے انتقام لینے کے لئے اس کے دُکھے ہوئے جی سے یہ صدا نکلتی ہے کہ

من از فریبِ عمارت گداشدم ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتادست

دراں حالیکہ آج تک نہ کسی کے "دلِ ویراں" میں آج تک کوئی پنہاں خزانہ پایا گیا اور نہ اس سے کسی نے فائدہ اُٹھایا، جب تک پہلے کوئی شخص فریبِ عمارت میں مبتلا نہیں ہو گیا۔

اس لئے اگر میں اپنے مساعی کے مقابلہ میں نتائج پر غور کروں تو مجھے بھی یہی تمشائم پہلو اختیار کرکے ہمیشہ کے لئے گوشۂ انزوا اختیار کرلینا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ جب میں اس حقیقت پر غور کرتا ہوں کہ کامیابی نام اس خیال کی تکمیل وانتہا کا نہیں ہے جو ایک شخص کی آرزو سے وابستہ ہوتا ہے، بلکہ وہ متعلق ہے تغیر محض سے جو کسی فضا میں پیدا ہوجائے، تو مجھے مسرور ہونا چاہئے کہ میں بڑی حد تک کامیاب ہوا اور مجھے اُصولاً اپنے مساعی کو بدستور جاری رکھنا چاہئے، گو میں اسے فقدانِ ہمت، تقاضائے عمر یا دیگر افکار وحوادث کے وجہ سے جاری نہ رکھ سکوں۔

ہرچند نگار جس آواز کو لیکر منصۂ شہود پر آیا وہ کوئی نئی آواز نہ تھی اور یقیناً دُنیا میں کوئی صدا نئی نہیں ہوتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس وقت اس کی ابتداء ہوئی، وہ زمانہ تھا جب پچھلی آوازوں کی گونج بھی فضا میں باقی نہ تھی اور ہندوستان کے مسلمان پھر اُسی نیند میں مبتلا ہوگئے تھے جس سے انھیں بارہا چونکایا جاچکا تھا اور چونک کر وہ پھر سو سو جاتے تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب سرزمینِ ہند میں نہضت وارتقاء کے آثار رونما ہورہے تھے، ایک خاص احساس کی لہر مختلف قوموں میں دوڑ چلی تھی اور حُریتِ فکر وضمیر میں از سرِ نو جان پڑ رہی تھی۔ سوائے مسلمانوں کے جتنی قومیں تھیں وہ ملکی ووطنی آزادی کے ساتھ ساتھ ذہنی آزادی حاصل کرنے کے لئے بھی دوڑ پڑی تھیں اور ایک دوربین نگاہ دیکھ سکتی تھی، ایک سوچنے والا دماغ سمجھ سکتا تھا کہ یہ سیلاب کہاں ختم ہوگا اور اس سے صرف وہی قوم جانبر ہوسکتی ہے جو خود بھی اپنے آپ کو اس طوفان میں ڈالکر ہاتھ پاؤں چلائے۔ لیکن مسلمان سو رہے تھے، اور صرف اس عقیدہ ویقین پر بے خبرانہ زندگی بسر کررہے تھے کہ "دُنیا مومنوں کے لئے قید خانہ ہے" اور یہاں کی مسرات وبرکات حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلاکر کون "کافر" بنے۔

مذہب کی غلط تعبیر نے اُن کے دل ودماغ پر مُہر لگادی تھی، اسلام کی صحیح تعلیم اور اسکی صحیح رُوح مفقود ہوجانے سے اُن پر جمود کی کیفیت طاری تھی، انسانیت وتمدن کے اُصول کو انھوں نے پسِ پشت ڈالدیا تھا، اخلاق وعمل کا حقیقی مفہوم وہ اوراد ووظائف میں گم کرچکے تھے، خود اعتمادی کا کوسوں پتہ نہ تھا اور محض "دُعائے گنج العرش" کے سہارے وہ اپنا بیڑا پار کرنا چاہتے تھے جدید علوم وفنون کا اکتساب ان کے نزدیک گمراہی میں مبتلا ہونے کے مترادف تھا اور سائنس کا اعتراف گویا خدا کا انکار۔ اُن کے اعمال وحرکات، اُن کے اقوال اطوار، اُن کی تعلیم وتلقین، اُن کی تگ ودو، الغرض اُن کی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں، صرف تقدیر کارفرما تھی اور تدبیر سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کی کتابیں، اُن کی تالیفات، اُن کے مدارس، اُن کے مواعظ وارشادات سب اسی ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے، یہاں تک کہ جرائد ورسایل جو عملی وذہنی روشنی پھیلانے کے مدعی بنکر رونما ہورہے تھے، وہ بھی اس باب میں خاموش تھے اور ایک "افسانہ خواں" سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت اس بزمِ خواب آلود میں نہ تھی۔

نگار نے گو ابتداء اجرا میں صراحتاً اس کا اعلان نہ کیا تھا کہ اس کا حقیقی مقصود کیا ہے، لیکن آخر کار یہ حقیقت لوگوں سے پوشیدہ نہ رہسکی کہ نگار نہ ادب لطیف کے احیاء کے لئے ظہور میں آیا ہے اور نہ صرف ایسی باتیں کہنے کے لئے جسے عام لوگ پسند کرتے ہیں۔

اس نے علم و تحقیق اور تنقید و تنقیح کے لحاظ سے ہمیشہ وہ چیز پیش کی جو قدامت پرستی کو توڑنے والی تھی اور کبھی ایک لمحہ کے لئے اس کی پرواہ نہ کی کہ جمہور کے خیال و اعتقاد کا مقابلہ کوئی نفع کا سودا نہیں۔

نگار نے صرف دو درس مسلمانوں کے سامنے پیش کئے ایک یہ کہ اُن کو زمانہ کا ساتھ دینا چاہئے اور دوسرے یہ کہ ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر، عصبیت کی زنجیر کو توڑ کر ملک و وطن کی خدمت میں دوسری قوموں کے دوش بدوش ملکر کام کرنا چاہئے۔ پھر چونکہ میں سمجھتا تھا کہ سب سے بڑا سنگ راہ جو ان کو دوسری قوموں سے ملنے نہیں دیتا، وہ مذہبی تعصب ہے اور اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین تھا اور ہے کہ دُنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی وسعت نظر اور بلند اخلاق کے لحاظ سے تمام دُنیا پر چھا جانے کا اہل ہے، اس لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ میں مسلمانوں کو بتاؤں اُن کا صحیح مذہب کیا ہے اور جن باتوں کو وہ اصل دین و عین مذہب قرار دیتے ہیں، وہ صرف فروع میں داخل ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے کفر و اسلام، نبوت و رسالت، معجزہ و کرامات، بہشت و دوزخ، جزا و سزا سبھی سے بحث کرنا ضرور تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ میں کافر و مرتد بنایا جاتا، ملحد و دہریہ کے لقب سے یاد کیا جاتا۔

پھر جو ہنگامہ اس سلسلہ میں میرے خلاف پیدا ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں لیکن جس چیز نے میری ہمت کو ضعیف نہیں ہونے دیا وہ صرف اس امر کا احساس ہے کہ باوجود اس تمام اختلاف کے نگار ایک جماعت کی ذہنیت بدلنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور عصبیت کی گرفت اُن پر بہت کچھ ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ ممکن ہے اس وقت یہ کامیابی غیر اہم سمجھی جائے، لیکن چونکہ آزادی کا تخم ایک بار بو دینے کے بعد بغیر بار آور ہوئے نہیں رہ سکتا، اس لئے مجھے مستقبل کی طرف سے اطمینان ہے اور پورا یقین رکھتا ہوں کہ ایک زمانہ آئے گا جب آج کی کہی ہوئی باتیں کل ایک ایک مسلمان کی زبان پر ہوں گی اور آخر کار وہ نقاب دور ہو کر رہیگا جو اسلام کے جمیل چہرہ پر مدعیانِ مذہب نے ڈال رکھا تھا۔

می گویم و بعد از من گویند بدستانہا

پھر جو زندگی میں مسلسل بارہ سال سے بسر کر رہا ہوں اور جس چیز کو میں اتنے زمانہ سے اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہوں، ظاہر ہے کہ اس کا چھوڑنا میرے بس کی بات نہیں، اس لئے میں ایک بار اور ہمیشہ کے لئے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو نگار کو صرف حکایات لطیف کے لئے وقف دیکھنا چاہتے ہیں، وہ مایوس ہو جائیں، وہ حضرات جو تصاویر و نقوش کی رنگارنگی سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ نگار کو نہ دیکھیں اور وہ احباب جو عقل و ضمیر کی آزادی کو پسند نہیں کرتے وہ نگار کے سطالعہ کی تکلیف گوارا نہ کریں، کیونکہ نگار جب تک جاری ہے اسی اُصول کے ساتھ جاری رہیگا جس کا اسوقت تک وہ پابند رہا ہے اور وہ ہمیشہ یہی تلقین کرتا رہیگا کہ انسان کا اولین فرض "انسانیت" کی پرستش کرنا ہے اور اگر کوئی مذہب بنی نوع انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا، بلکہ صرف مراسم و ظواہر کو دین و ایمان قرار دیتا ہے تو وہ مذہب ہرگز پیروی کے قابل نہیں۔

اسی سلسلہ میں غالباً یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ہر چند نگار کی اشاعت کا تنہا مقصود وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا، لیکن اسی کے ساتھ جو علمی و ادبی خدمات اس نے گزشتہ بارہ سال میں انجام دی ہیں وہ بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں تحقیق تاریخی، مباحث علمیہ، معلومات جدیدہ، تنقیدات عالیہ اور انشاء لطیف میں کونسی چیز ایسی تھی جو نگار نے بلند ترین معیار کیساتھ پیش نہیں کی۔ اس لئے وہ لوگ جو صرف ان چیزوں کے دلدادہ ہیں ان کو بھی نگار کی طرف سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ خصوصیات آئندہ بھی بہر حال قایم رہیں گی اور غالباً زیادہ تکمیل کے ساتھ۔

زلزلہ کی تباہکاریاں ——

حوادث طبیعی کے بعض مناظر اسدرجہ عبرتناک ہوتے ہیں کہ انسان کی تمام حکمت فرمائیاں ان کے سامنے بچوں کا کھیل نظر آنے لگتی ہیں اور علم و عقل کی بیچارگی کا احساس ہم کو حیران و ششدر بنا دیتا ہے۔

کلام مجید میں متعدد جگہ ایسے مناظر کے طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

سورۂ حج میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

فکاین من قریۃ اھلکناھا وھی ظالمۃ فھی خاویۃ علی عروشھا

یعنی بہت سی ایسی بستیاں ہیں جن کو ہم نے اُن کے ظلم کے وجہ سے ہلاک کر دیا اور وہ سرنگوں کر دی گئیں۔

سورۂ نمل میں ایک جگہ اسی قسم کے منظر کا حال یوں بیان ہوتا ہے:۔

تلک بیوتھم خاویۃ بما ظلموھم یعنی یہ کھنڈر ہیں اُن لوگوں کے جنھوں نے خود اپنے ظلم سے ان ویرانیوں کو دعوت دی۔

سورۂ حاقہ میں قوم عاد کی ہلاکت کے متعلق فرمایا گیا ہے:۔

واما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیۃ ..... فتری القوم فیھا صرعی کانھم اعجاز نخل خاویۃ

یعنی جب قوم عاد کی ہلاکت کے لئے تیز و پرشور آندھی بھیجی گئی، تو لوگ اوندھے منہ اس طرح مرے پڑے تھے گویا کہ کھوکھلے کھجوروں کے تنے پڑے ہوئے ہیں۔

سورۂ کہف میں ایک جگہ پانی کے خشک ہوجانے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

یصبح ماءھا غورا

پھر مظفر پور، پٹنہ، جمال پور اور مونگیر وغیرہ میں جو تباہیاں حال کے زلزلہ سے آئی ہیں کیا وہ کچھ اور تھیں۔ وہی بیشمار عمارتوں کی مسماریاں، وہی ہزارہا انسانوں کی تباہیاں اور وہی دریا گنگ کا زمین کے اندر غائب ہوجانا۔ جنھوں نے ان

مناظر کو دیکھا ہے اُن سے پوچھئے کہ کرب و بُکا کا وہاں کیا عالم ہے اور انسانی لاشوں کو چیل کوے کس طرح نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ لاکھوں کی دولت مسمار شدہ مکانوں کے اندر دبی پڑی ہے، ہزاروں بچے یتیم، سیکڑوں عورتیں بیوہ اور نہ جانے کتنے مرد خانماں برباد ہو چکے ہیں۔

تو کیا یہ کوئی عذاب الٰہی تھا جو صوبۂ بہار پر نازل ہوا۔ کیا کوئی قہر خداوندی تھا جس نے اس صوبہ کے باشندوں کو تباہ کیا اور کیا تباہ شدہ بستیاں ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ گنہگار انسانوں کی آبادیاں تھیں جن کو اُلٹ کر معدوم کر دیا گیا؟

مرنے والوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ جوان بھی تھے اور معصوم بچے بھی ضعیف مرد بھی تھے اور بہت سی نیک بیویاں بھی۔ پھر یہ کیسا انصاف ہے، کیسا عدل ہے، کس طرح کا انتقام ہے، کس نوع کا قہر و غضب ہے، کس انداز کی برہمی ہے —— اہلِ مذاہب سے پوچھئے تو وہ اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہ دے سکیں گے کہ خدا فعالِ مطلق ہے، بے نیاز ہے، اور وہ کسی طرح مسئول نہیں ہو سکتا —— وہ لوگ جو ایسے مظاہر کو صرف حوادث طبیعی سے منسوب کرتے ہیں، وہ بھی یہی کہیں گے لیکن فرق یہ ہے کہ مذہبی تاویل ہمارے اخلاق پر موثر ہوتی ہے اور علمی توجیہہ کوئی اثر اس قسم کا پیدا نہیں کرتی۔

اب غور کیجئے کہ ان واقعات فجاعی سے ہمارے اخلاق مذہبی پر کیا اثر پڑنا چاہئے؟

ہندوؤں نے ہون کر کے دیکھ لیا لیکن یہ مصیبت اُن کے سر سے نہ ٹلی، مسلمانوں نے مسجدوں میں گڑگڑ کر خدا سے التجائیں کیں، لیکن وہ تباہ ہونے سے نہ بچے۔ پھر اس سے بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ خدا کے نزدیک تفریق مذاہب کوئی معنی نہیں رکھتی اور اس کی نگاہ میں سب ایک ہیں، نہ اس کا رحم و کرم کسی مسلمان کی جستجو کرتا ہے اور نہ اس کا قہر و غضب غیر مسلموں کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی ذات تاثر و انفعال سے بلند، جذبۂ تفریق و امتیاز سے ارفع اور اُصولِ نیایش و عبادت کے احساس سے بے نیاز ہے۔

مسلمان لاکھ کہا کریں کہ خدا صرف انھیں کا ہے اور انھیں کی نجات اس کا مقصود ہے، ہندو ہزار کہیں کہ انھیں کا مذہب پوتر ہے اور باقی سب گمراہ ہیں، خدا ان مزعومات و مفروضات کا پابند نہیں ہے۔ اور یہ شرک و اسلام کے جھگڑے صرف ہماری خود غرضیوں کے مظاہر ہیں جن سے خدا کو کوئی تعلق نہیں۔

پس سوچو اور سمجھو کہ صحیح راستہ وہی ہے جو آپس میں محبت کرنا بتاتا ہے اور انسانوں میں صرف اس لئے پھوٹ نہیں ڈالتا کہ ایک کے گلے میں زنار ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں تسبیح۔

جز سخن کفر و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می ردد

گوالیار کی بزمِ ادب

یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی نے لشکر (گوالیار) میں ایک "بزم اُردو" قایم کر رکھی ہے جو عرصہ سے زبان کی خاموش خدمت انجام دے رہی ہے۔ اسکی ماہانہ صحبتیں بھی برپا ہوتی ہیں اور سالانہ جلسے بھی، ادبا، ملک کو بھی دعوت دیجاتی ہے اور فضلاء وطن کو بھی کسی نہ کسی طرح کھینچ کر بلایا جاتا ہے۔ الغرض ایک ادبی انجمن کے جتنے فرائض ہیں وہ بوجوہ احسن انجام دئے جاتے ہیں اور سال میں دو چار دن عجیب لطف و دلچسپی کیساتھ بسر ہوجاتے ہیں۔

امسال بھی یہ احتفالِ سالانہ فروری کی ۲۶، ۲۷، ۲۸ کو گوالیار میں منعقد ہونے والا ہے اور وہ تمام قوتیں جو گزشتہ جلسوں کے کامیابی کیلئے علیحدہ علیحدہ صرف کی گئی تھیں، اب یکجائی طور پر اس جلسہ کو کامیاب بنانے کے لئے وقف کردی گئی ہیں اور اُس نظم و اہتمام کو دیکھتے ہوئے جو ڈاکٹر صاحب موصوف کے پیشِ نظر ہے، بجا طور پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ شاید ہی ہندوستان میں کوئی ادبی جلسہ اسدرجہ پُر لطف و مکمل اس سے قبل منعقد ہوا ہو — ہندوستان کا کوئی ادیب و شاعر، کوئی صاحب علم و فضل ایسا نہیں جسے دعوت نہ دی گئی ہو اور مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہے کہ ان میں سے اکثر نے شرکت کا وعدہ فرمالیا ہے۔ اس سے قبل بزم کے طرف سے ملک میں دعوت نامے شایع کئے گئے تھے لیکن بعض اسباب کی بناء پر تاریخ ملتوی کرنا پڑی جسکی اطلاع تمام حضرات کو دیدیگئی — اب فروری کی یہ تاریخیں چونکہ یقینی طور پر متعین ہوچکی ہیں اسلئے بزم اُردو کے طرف سے پھر نوید شایع کئے جارہے ہیں جو نگار کی اشاعت سے قبل غالباً تمام حضرات کے ہاتھوں میں ہوں گے —

ڈاکٹر اقبال، سر تیج بہادر سپرو، سر عبدالقادر، سر راس مسعود، نواب نصیر حسین خیال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی وغیرہ تمام اکابر نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہے اور پنجاب و یوپی، بنگال و بہار، سی پی و دکن وغیرہ کے اکثر ارباب علم و ادب نے اس میں عملی حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

علاوہ اس کے سب سے زیادہ خصوصیت جو اس سے قبل کسی انجمن کو حاصل نہیں ہوئی وہ یہ ہے کہ عالیجناب مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر بالقابہ صدر اعظم دولت آصفیہ کو صدارت کے لئے تجویز کیا گیا ہے اور ایک وفد حیدرآباد جارہا ہے تاکہ باقاعدہ دعوت نامے کو پیش کرکے شرف منظوری حاصل کرے۔ میں بھی اس وفد کے معیت میں ۲۷ جنوری کو گوالیار سے حیدرآباد روانہ ہوجاؤں گا — صدارت کے لئے یہ انتخاب نہ صرف اس لحاظ سے موزوں و برمحل ہے کہ اسوقت دولت آصفیہ دکن جامعۂ عثمانیہ کے قیام سے سب سے بڑی خدمت اُردو کی انجام دے رہی ہے، بلکہ خود سر مہاراجہ بہادر کی خدمات اُردو زبان کے متعلق اسدرجہ گرانقدر اور اتنی اہم ہیں کہ ان کے اعتراف پر ہر شخص مجبور ہے — اس کے ساتھ یہ خبر بھی غالباً مسرت سے سُنی جائے گی کہ استقبالیہ کمیٹی کی صدارت جناب کرنل ہکسر صاحب نے قبول فرمائی ہے جو بین الاقوامی شہرت رکھنے والے لوگوں میں سے ہیں اور جو خود اُردو زبان سے بہت شغف رکھتے ہیں جناب سردار آنگڑے صاحب بھی جو گوالیار میں پرائیویٹ سکریٹری کی اہم خدمت پر مامور ہیں، ذاتی طور پر اسقدر دلچسپی لے رہے ہیں کہ بعض دعوت نامے خود ان کی طرف سے شایع ہوئے ہیں۔ الغرض بزم اُردو کا یہ جلسہ کوئی معمولی جلسہ نہیں جسے صرف ارکانِ بزم ہی مدعو کرنا چاہتے ہیں بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ غیر سرکاری طور پر خود ریاست گوالیار دعوت دے رہی ہے اور اس لئے بہی خواہانِ اُردو کو غور کرنا چاہئے کہ ان حالات میں اُن کی شرکت ضرورت و مصلحت کے لحاظ کس قدر ناگزیر ہے — ممکن ہے کہ بعض اکابر فن کو کسی فروگزاشت کے بناء پر دعوت نامہ نہ پہونچے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بزم اُردو ان کی تشریف آوری کی متمنی نہیں اس لئے آپ خود بغیر رسمی رقعہ کا انتظار کئے ہوئے براہ راست سکریٹری "بزم اُردو لشکر" کو اطلاع دیجئے کہ آپ کسوقت وہاں پہونچیں گے تاکہ آپ کا استقبال کیا جائے — ممکن ہے کہ بعض ایسے حضرات جو مدعو کئے گئے ہوں اپنی اقتصادی مجبوری کے وجہ سے شرکت نہ فرماسکیں، اس لئے یہاں یہ ظاہر کردینا بے محل نہ ہوگا کہ ایسے احباب کے لئے "بزم اُردو" کے طرف سے ان کے مصارف آمد و رفت کا حقیر ہدیہ پیش کردیا جائے گا اور اُمید ہے کہ وہ اسے قبول فرمائیں گے — اب آخر میں مجھے ایک مشورہ بھی دینا ہے اور وہ یہ کہ جو حضرات تشریف لائیں وہ یہ سمجھ کر آئیں کہ اُردو کی خدمت ان کو انجام دینا ہے اور اس لئے کوئی نہ کوئی "پیام" سُنانا ان کے لئے ضروری ہے — کوشش کی جارہی ہے کہ صدر کے جلوس استقبال اور جلسہ کے مختلف نشستوں کا فلم بھی طیار کیا جائے۔ اُمید ہے کہ میرے احباب اور نگار کے جملہ قلمی معاونین شرکت کی زحمت گوارا فرمائیں گے اور مجھے موقع دیں گے کہ میں گوالیار میں ان کا خیر مقدم کروں۔

نیاز

زبان اُردو کے ارتقائی منازل

آج ہمیں اس اہم مسئلہ پر بحث کرنی ہے کہ آیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے یا عام ہندوستانیوں کی، اور اس کی تخلیق و تدوین میں صرف اہل اسلام نے حصہ لیا ہے، یا برادران وطن نے بھی، مگر قبل اس کے کہ اصل موضوع پر روشنی ڈالی جائے، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ کسی زبان کے وجود میں آنے کے اسباب و علل کیا ہیں؟ معمولی غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ تجارت و حکومت سیر و سیاحت، نقل مکان، و مذہبی تحریک نے زبان کی تخلیق میں بڑی مدد دی ہے، چنانچہ سامی اور آریہ زبانوں کی مختلف شاخیں انھیں اسباب و علل کے ماتحت وجود میں آئیں،

اب آئیے اردو کے منازل ارتقاء پر غور کریں، یہ تو ظاہر ہے، کہ اُردو نہ خالص سامی زبان ہے، نہ خالص اندوجرمانی (Indo Germanic) بلکہ سامی اور اندوجرمانی قوموں کے اختلاط و امتزاج سے اس کا وجود ہوا ہے، کیونکہ اس کے لغات و قواعد میں سامی اثرات کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں، اور آریہ لغات کے بھی، اب دیکھنا یہ ہے، کہ اُردو زبان پر سامی اور آریہ لغات نے کیونکر اثر ڈالا، ؟ اس کے لئے کسی قدر تحقیق و کاوش غور و مطالعہ سے کام لینا ہوگا،

اُردو زبان ہندوستانیوں اور اہل اسلام کے خلط و ربط سے وجود میں آئی، مذہب اسلام ایک ایسی سامی تحریک تھا، جس نے دنیا کے تمام شعبوں میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا چنانچہ مصر کا ایک ماہر لسانیات اسرائیل ولفنسون لکھتا ہے،

کانت الھجرۃ الاسلامیہ الی خارج الجزیرۃ آخر حادث سامی عظیم وقع فی جزیرۃ العربیہ فاھتزت لہ ارجاء العالم اھتزازا عنیفا وصدرت عنہ تموجات فکریہ ونفسیۃ عظیمۃ شملت اصقاع آسیا وافریقیہ واوربا واثرت فی ھذہ البلاد تاثیرات ذات نتائج خطیرۃ جعلت تاریخ البشری فی کل ھذہ الجھات ینحو منحا جدیدا[1]	جزیرۂ عرب سے باہر اسلام کا شیوع سامی قوم کا وہ آخری واقعہ عظیم تھا، جو عرب میں واقع ہوا، جس نے دنیا کے کناروں میں سخت ہلچل پیدا کر دی اس سے بڑی بڑی ذہنی اور نفسی موجیں نکلیں جس میں ایشیا افریقہ اور یورپ کے ممالک شامل ہوئے، اور ان شہروں میں اہم نتیجہ خیز اثرات پیدا ہوئے۔ جس نے ان تمام اطراف میں انسانی تاریخ کے اندر ایک جدید رجحان پیدا کر دیا

[1] تاریخ اللغات السامیہ مطبوعہ مصر ص ۱۶۲

چونکہ اسلام کی تبلیغی زبان عربی تھی اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے، کہ عربی زبان سے ہندوستانی زبان کو کوئی علاقہ رہا ہے یا نہیں، ؟ اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل تاریخی شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں،

تجارت بعثت اسلامیہ سے قبل ہندوستان کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے اور ساحل مالا بار میں عرب تاجروں کی بود و باش تھی، چنانچہ عربی اور ہندوستانی نسل کے اختلاط سے ایک قوم یہاں پائی جاتی ہے، جس کو "موپلا" کہتے ہیں ان کی زبان "ملیالم" ہے،

عرب اپنی حکومت سے قبل بھی یہاں قیام رکھتے تھے، اور مکہ میں ہنود کی بھی آمد و رفت تھی کیونکہ یہاں بہت بڑا صنمخانہ تھا، عربوں اور ہندوستانیوں کا پہلا اختلاط تجارتی اغراض اور مماثلت عقائد پر مبنی تھا[1] اس لئے اندازہ ہوتا ہے، کہ عربی اور سنسکرت زبانیں بعثت اسلامیہ کے قبل ممزوج ہو چکی تھیں،

حکومت اسلام عالم وجود میں آیا تو سب سے پہلے مہلب بن ابی صفرہ نے پہلی نصف صدی ہجری میں ہندوستان پر حملہ کیا اس زمانہ میں جستہ جستہ بہت سے لوگ مسلمان ہوئے، عہد صحابہ ہی میں بہت سے ہندوستانی راجہ مسلمان ہو گئے تھے، چونکہ بت پرستی کے سلسلہ میں عرب میں ان کی آمد و رفت تھی۔ اسی طرح وہ بعثت اسلام کے وقت بھی آئے، اور دین اسلام قبول کیا پھر پہلی صدی ہجری کے اواخر میں حجاج بن یوسف نے اپنے داماد عماد الدین محمد بن قاسم کو سندھ کی فتح کے لئے روانہ کیا اس نے سندھ فتح کیا، محمد بن قاسم جب ولید بن عبد الملک کے حکم سے مارا گیا تو تمیم انصاری کی اولاد نے سندھ پر حکومت کی اس سلسلہ میں عرب کے بہت سے خاندان سندھ میں آ گئے یہی وجہ ہے، کہ سندھ نے بہت بڑے بڑے صوفیہ اور محدثین پیدا کئے حضرت ابو رجاء محدث اور شیخ ابو علی صوفی اسی زمین کے نونہال تھے، شیخ ابو علی، سندی حضرت بایزید بسطامی کے عہد میں گزرے ہیں، حضرت بایزید فرماتے ہیں کہ میں شیخ صاحب سے "فنا" کا درس لیتا تھا، اور شیخ صاحب مجھ سے، سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے[2]، اسی بنا پر ڈاکٹر نکلسن نے یہ قیاس پیش کیا ہے، کہ تصوف اسلامیہ پر ہندوستانی یوگ کا اثر پڑا ہے،

سیر و سیاحت یوں تو مسلمانوں میں بڑے بڑے سیاح گزرے ہیں۔ جنھوں نے اپنے حالات سفر قلمبند کئے، اصقاع عالم کے جغرافی خصایص پر روشنی ڈالی، مسلم بن حمیر، جعفر بن احمد المروزی ابن فضلان، ابن خرداذبہ، جہانی، الاصطخری، ابن حوقل، یاقوت حموی، البکری، المقدسی، ادریسی وغیرہ کے جغرافی کارناموں سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن جہاں تک ہندوستانی سیاحت کا تعلق ہے اس سلسلہ میں مسعودی، البیرونی، اور ابن بطوطہ نے وقیع خدمات انجام دئے، مسعودی (چوتھی صدی) بغداد کا رہنے والا تھا، اس نے اپنے آغاز شباب

---

[1] تاریخ فرشتہ مقالہ ۸ [2] نفحات الانس ص ۶۰

ہی میں اسلامی دنیا کا بڑا حصہ دیکھ ڈالا پہلے پہل وہ ہندوستان میں آیا اور مختلف ممالک کی سیر کی پھر دوبارہ آیا اور کچھ دنوں تک کمبا جہ اور دکن میں قیام کیا[1]۔ اس کے متعلق ایک فرانسیسی عالم ڈی بویر لکھتا ہے،

"وہ ہر اس چیز کی تعریف کرتا ہے، اور اس سے دلچسپی لیتا ہے، جو نوع انسانی سے متعلق ہے، جہاں کہیں وہ جاتا ہے، آدمیوں سے مل کر وہ کچھ سیکھتا ہے، روزانہ زندگی اور مذہب کے معمولی امیال وعواطف اور فلسفہ کی ہوائی خیال آرائیاں اس کا مرکز توجہ نہیں اس کو اپنی استعداد کا اندازہ ہے۔ اور آخری دم تک جبکہ وہ مصر میں بیری کے دن گزار رہا تھا، مطالعہ تاریخ کو وہ اپنی تسکین کا واحد ذریعہ اور اپنی روح کی دوا بتاتا ہے"[2]

البیرونی نہ صرف ایک سیاح اور جغرافی تھا بلکہ اس نے بہت دنوں تک ہندوستان میں قیام پذیر رہ کر سنسکرت زبان کی تعلیم حاصل کی، یہاں کی معاشرت و مذہب، شاعری و ادبیات، فلسفہ و حکمت، اوہام و خرافیات، ملک کی جغرافی و طبعی خصوصیات سے اپنی مشہور تصنیف کتاب الہند میں محققانہ بحث کی اس کے متعلق نولدیکہ "تاریخ فلسفہ اسلام" لکھتا ہے،

"اس سے اس عہد کی خصوصیت کی وضاحت ہوتی ہے، گو کندی اور مسعودی کو فارابی اور ابن سینا کی بہ نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہے، کہ اس کے (بیرونی) اساتذہ میں مشمول ہوں، بیرونی کی نظر مطالعہ خاص طور پر ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور قومیات تک محدود تھی، اس کا مشاہدہ عمیق اور قوت تنقیدی عمدہ تھی، اپنی بہتیری علمی مشکلات کے حل کرنے کے لئے اس کو فلسفہ کا بھی مرہون منت ہونا پڑا۔ اور اس نے مسلسل اس پر بہ حیثیت ایک مظہر تہذیب ہونے کے، اپنی توجہ مبذول رکھی، بیرونی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فیثاغورثی افلاطونی فلسفہ، ہندوستانی حکمت اور بہت سے صوفیانہ نظریات میں جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے، ان کو تعجب خیز شہرت دی، جب وہ علوم یونان سے عربوں اور ہندوستانیوں کے مساعی و اعمال کا موازنہ کرتا ہے۔ تو اس کا یونانی علوم کی برتری دکھانا اور بھی حیرت زا معلوم ہوتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہندوستان نے (عرب کا کیا ذکر ہے) کوئی سقراط نہیں پیدا کیا، وہاں منطقیانہ طریقہ نے حکمت سے مغالطہ کو دور نہیں کیا پھر بھی وہ انفرادی اعتبار سے بعض ہندوستانی فلاسفہ پر منصفانہ محاکمہ کرتا ہے، اور وہ آریہ بھٹ (مستوطن عظیم آباد بہار) کے پیروؤں کے متعلق ذیل افکار پسندیدگی کے ساتھ نقل کرتا ہے، "ہم لوگوں کے لئے ان چیزوں کا علم حاصل کرنا ضروری ہے، جو آفتاب کی شعاع میں منور ہیں جو چیزیں اس دائرہ سے خارج ہیں، گو ان کی وسعت بے پایاں ہو لیکن ہم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے جو جگہ آفتاب کی شعاع نہیں پہونچتی، وہاں حواس کو ادراک نہیں ہو سکتا اور جن چیزوں کا حواس کو ادراک نہیں ہو سکتا ان کا

---

[1] نفحات الانس ص ۶

[2] History of the Saracens. ص ۴۶۴ - ۴۶۵
D. Boer's History of philosophy in Islam ص ۹۹

ہمیں علم بھی نہیں ہو سکتا " اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیرونی کا فلسفہ کیا تھا ؟ اس کے عقیدہ میں علم یقینی صرف محسوسات کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے، جن کو منطقیانہ معلومات کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے، وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمیں ایک فلسفۂ عملی کی ضرورت ہے، جس کے ذریعہ ہم دوست دشمن میں تمیز کر سکیں یقیناً اس کو اس کا تصور بھی نہ ہوگا کہ اس نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا، جو اس موضوع پر کہا جا سکتا تھا "

ابن بطوطہ اس عہد میں وارد ہندوستان ہوا، جب اردو اپنی نشأۃ کے دوسرے دَور میں تھی، یعنی افاغنہ سریر آرائے حکومت تھے، اور سنسکرت زبان جو عربی لغات کے ساتھ ممزوج ہو چکی تھی، بھاشا کی صورت میں فارسی کے ساتھ مخلوط ہو رہی تھی، جس کی تفصیل آگے آتی ہے، اس لئے ابن بطوطہ کی سیاحت اُردو کی تاریخ کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، لیکن مسعودی اور بیرونی کی تصنیفات نے ایک طرف تو اہل اسلام کو ہندوستانی ادبیات سے بہت کچھ آشنا کیا دوسری طرف عربی زبان میں سنسکرت کے بہت سے لغات والفاظ داخل ہو گئے، اسرائیل ولفنسون مصر کے ماہر لسانیات نے اپنی کتاب میں سامی زبانوں کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے، ثابت کیا ہے، کہ بابلی و آشوری، آرامی و عبری زبانوں کو عربی سے خاص مماثلت ہے، اور لغات سامیہ کا ایک قاموس دے کر سامی زبانوں کے مشابہ الفاظ کو یکجا کر دیا ہے لیکن اس نے عربی اور سنسکرت کے علاقہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گویہ ایک متنازع فیہ مسئلہ ہے، کہ عربی و سنسکرت کے نحو و صرف میں کوئی ربط پایا جاتا ہے یا نہیں ؟ اس کے متعلق مستشرقین کے مختلف خیالات ہیں۔ چنانچہ ولفنسون، سامی اور آریہ زبانوں کے تناسب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے،

فبعضهم رجح ان جميع اللغات السامية واللغات الآرية كانت في عصر من العصور لغة واحدة

انمیں بعض کا یہ رجحان ہوا کہ تمام سامی اور آریہ زبانیں کسی زمانہ میں ایک زبان تھیں،

لیکن بعض ماہرین لسانیات نے اس کا مذاق اُڑایا۔ چنانچہ برو کلمان، اور نولدکہ نے اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا،

فاذا كان هناك اصل اشتركا فيه فلا يكون ذلك الا قبل التاريخ وما كان قبل التاريخ لا يدخل في حظيرة البحث عند علماء اللغات[۵۲]

پس جب کوئی ایسی اصل تھی جو (آریہ اور سامی زبانوں کیلئے) مشترک تھی، تو یہ تاریخ کے قبل کا واقعہ ہوگا اور جو تاریخ کے قبل کی چیز ہے، وہ ماہرین لسانیات کے نزدیک حاطۂ بحث سے خارج ہے

---

۵۱ " ہسٹری آف فلاسفی ان اسلام " مؤلفہ ڈی بوریہ کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ عام مقبولیت کے باعث ۱۹۰۳ء میں اس کا انگریزی ترجمہ لوزک اینڈ کمپنی (لندن) نے شائع کیا۔ ۱۹۳۳ء میں اس کا دوسرا اڈیشن نکلا یہی جدید الشیوع نسخہ پیش نظر ہے، ایڈورڈ۔ آر۔ جونس اس کے مترجم ہیں (ملاحظہ ہو ص ۱۴۶) ۵۲ تاریخ اللغات السامیہ مطبوعہ مصر ص ۱۷، یہ کتاب

پھر بھی مروج الذہب اور کتاب الہند کے صفحات کا جائزہ لیا جائے، تو پتہ چل سکتا ہے کہ مسعودی اور بیرونی نے سنسکرت اور عربی کو کس طرح مخلوط کیا ہے،

نقل مکان و مذہبی تحریک

غزنویہ اور افاغنہ دہلی کے قبل ہی بعض قبایل عرب اور سادات ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے، ان لوگوں کی زبان عربی تھی، اس لئے اُردو کے ارتقاء میں پہلے عربی زبان کے عناصر شامل ہوئے، اس کے بعد فارسی زبان نے کئی سو برس تک اسی عربی اور بھاشا کے مخلوط مواد میں اپنا اثر ڈالا، وہ عربی قبائل جو جزیرۂ عرب سے ہجرت کر کے ایران میں آباد ہو گئے تھے، بتدریج ہندوستان میں آنے لگے، چنانچہ علامہ سراج الدین رفاعی حضرت عمر الاطرف ابن حضرت علیؓ کے اعقاب کے متعلق لکھتے ہیں

ولعمر الاطرف هذا ذيل ببلخ وحران وواسط واليمن وطبرستان والهند وملتان والسند

اور ان حضرت عمر الاطرف کی اولاد، بلخ، حران، واسط، یمن، طبرستان، ہند، ملتان اور سندھ میں پائی جاتی ہے

اسی طرح حضرت امام حسن کے پوتے ابراہیم الغمر کے متعلق لکھتے ہیں کہ آپ کے دو بیٹے ہوئے ان میں ایک کا نام حسن الشیخ تھا، دوسرے کا ابراہیم طبا طبا، حسن الشیخ کے اعقاب کا تذکرہ علامہ موصوف یوں کرتے ہیں

اما حسن الشيخ فاعقب من الحسن وهو اعقب من رجلين ابى جعفر محمد و ابى القاسم علي المعروف بابن معيه وهي امه انصارية عرف بهما ولهم ذيل طويل بمصر والعراق ومنهم بدهلي من الهند [۱]

لیکن حسن شیخ آپ کے ایک صاحبزادہ حسن سے اولاد ہوئی انھوں نے دو لڑکے ابی جعفر محمد اور ابو القاسم علی معروف بہ ابن معیہ چھوڑے، معیہ ابو القاسم کی انصاری ماں تھیں جنسے وہ مشہور ہوئے۔ انلوگونکی اولاد کثیر مصر اور عراق اور انمیں بعض ہندوستان کے شہر دہلی میں ہیں

عام قبائل عرب کے علاوہ بہت سے مشایخ آئے، جنکا مطمح نظر تبلیغ و ارشاد تھا۔ چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین سنجری (متوفی سنہ) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۶۳۴ھ) خواجہ فرید الدین گنج شکر (متوفی ۶۶۰ھ) خواجہ نظام الدین خالدی (متوفی ۷۲۵ھ) وغیرہ نے ارتقائے اُردو میں بڑی مدد دی، چونکہ قومی اصلاح اور روحانی بلاغ و ارشاد کے سلسلہ میں عوام الناس کو آپ حضرات کے ساتھ گہری وابستگی تھی، خواجہ معین الدین سنجریؒ سلطان التمش کے عہد (متوفی ۶۳۳ھ) میں وارد ہندوستان ہوئے۔ خواجہ قطب الدین قصبۂ "اوش" سے تشریف لائے تھے، جو ماوراء النہر کے علاقہ میں تھا اسی طرح شیخ فرید الدینؒ قصبہ کہوتوال سے جو ملتان کے علاقہ میں ہے، تشریف لائے، شیخ نظام الدین اولیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) ۱۹۲۹ء میں مصر کی ایک وقیع علمی مجلس "جنتہ الترجمہ والتالیف والنشر" نے شائع کی ہے، موضوع کے لحاظ سے عربی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے، اس میں بابلی آشوری، عبری و آرامی، اور عربی زبانوں کی مکمل تاریخ ہے، ان زبانوں کے قدیم دجدید خطوط کے نقوش بھی پائے جاتے ہیں، اس پر ایک تبصرہ لکھا جا رہا ہے [۵] صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار ص ۲۸، یہ کتاب اب نادر الوجود

کے دالد احمد دانیال غزنیں سے ہندوستان میں آئے ، دکن کے اسلامی سلاطین کے عہد میں بھی اولیا کبار ہندوستان میں آئے ، اگر ہر شاہی خاندان کے عہد کے بزرگوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے ، تو پتہ چلے گا ، کہ ایرانی شعرا کی طرح عراق عرب ، و ایران کے صلحا و صوفیہ بھی ہندوستان میں کثرت کے ساتھ آئے اور ان کی بیعت و رشاد نے عوام الناس کی زبان پر گہرا اثر ڈالا

سادات بلگرام جن میں ترمذی ، رضوی ، و صغراوی ہیں وہ عراق و ایران سے آئے ، بلگرام میں سب سے پہلے خواجہ عماد الدین تشریف لائے اس کے بعد سید محمد صغری تشریف لائے جو حضرت زید شہید ابن حضرت امام زین العابدین کے اعقاب میں ہیں اور انھیں کے اخلاف گرامی سے یہ شہر علوم و معارف کا سرچشمہ بنا ، خواجہ عماد الدین تو بلا واسطہ عرب سے تشریف لائے تھے لیکن سادات صغراوی عراق یا عجم سے آئے اسی طرح بعض خاندان ترمذ سے آئے ، سادات رضوی کے جد امجد کمال الدین غزنین سے تشریف لائے ، خواجہ عماد الدین اور سید محمد صغری دونوں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مریدوں میں تھے[1]

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ابتدائے ساتویں صدی میں گزرے ہیں اور صفیر مرحوم مؤلف تاریخ بلگرام سید محمد صغری کو آپ کا مرید بتاتے ہیں اس سے نتیجہ نکلتا ہے ، کہ سید محمد صغری کا خاندان اواخر ساتویں صدی میں ہندوستان میں آباد ہو گیا تھا ، لیکن اس عہد کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے بعد علامہ رفاعی نے صحاح الاخبار لکھی لیکن انھوں نے سادات زیدی کو صرف عراق و حجاز تک محدود بتایا ہے ، چنانچہ عیسی مولم الاشبال بن زید شہید کے صاحبزادوں زید ، احمد ، اور حسین کے متعلق لکھتے ہیں

ولهم عقب طويل وذيل جليل بالعراق والحجاز انکی کثیر اولاد و اعقاب گرامی عراق و حجاز میں پائے جاتے ہیں

سادات صغراوی (بلگرام) اپنا سلسلہ محمد بن عیسیٰ مولم الاشبال بن زید شہید تک پہونچاتے ہیں تعجب ہے ، رفاعی نے اس خاندان کے ورود ہند کے متعلق کیوں نہ لکھا ، حالانکہ انھوں نے بعض ہندوستانی خاندانوں کے متعلق لکھا ہے ، جیسا کہ سطور بالا میں لکھا جا چکا ، سید محمد صغری کے جد ششم سید ابو الفرح واسط ( ) کے رہنے والے تھے ، اسی لئے سادات صغراوی "واسطی" کہلاتے ہیں

الغرض سندھ کی عربی حکومت مٹنے کے بعد اکثر قبایل جو ہندوستان میں آئے وہ بلا واسطہ عرب سے نہیں آئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) ہے ، اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے جرمنی ، اور انگلستان کے مستشرقین نے اس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا ہے ، چنانچہ انگریز مستشرق سر ای ڈینیسن نے اس کی فرمایش پر اس کتاب کا مقدمہ لکھ رہا ہوں ، ممکن ہے یہ کتاب علامہ موصوف گب موریل کی طرف سے شایع کرائیں جیسا کہ انھوں نے اپنے مکتوب گرامی میں ظاہر کیا ہے [1] تاریخ بلگرام مؤلفہ سید فرزند احمد صفیر ج ۱ ص ۳-۵

تھے، بلکہ ایران سے آئے ان کی زبان فارسی تھی، اس طرح ہندوستان کی مادری زبان میں جس میں عربی زبان کے بہت سے عناصر شامل ہو چکے تھے، فارسی زبان مخلوط ہونے لگی، گو پہلی صدی ہجری کے اثر حکومت نے ہندوستان کی سر زمین سے عربی زبان کے بہت سے ادیب جلیل و محدث ثقہ پیدا کئے لیکن جب فارسی کا دور ہوا تو خود مسلمانوں نے بھی سنسکرت و بھاشا کی طرف کافی توجہ کی اور ہنود میں تو فارسی کے ایسے ایسے بے مثل ادیب و شاعر پیدا ہوئے، کہ دنیا آج ان کے بدیع افکار و جدت زبان پر پھروں سر دھنتی ہے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، الغرض ہندوستان میں فارسی زبان کی تاریخ کا آغاز عہد غزنویہ سے متعین کریں تو گویا پانچویں صدی سے تیرہویں صدی تک فارسی زبان نے ہندوستان پر اپنا سکہ جمائے رکھا

عہد غلامان سے لے کر آواخر لودی کے درمیان خلجیہ، تغلق، سید وغیرہ نے حکومت کی ان تمام خاندانوں کے دور حکومت میں، سلطنت کی زبان فارسی تھی پھر بھی ہنود نے فارسی کی طرف ایسی توجہ نہیں کی، جیسا کہ عہد مغلیہ میں پایا جاتا ہے، مغلوں کی حکومت نے خود فارسی زبان کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا، ایران کے صفوی سلاطین شعر و ادب اور فنون لطیفہ کے بہت بڑے حامی تھے لیکن پھر بھی دربار مغل کا آوازہ جود و سخا اور شہرۂ ادب نوازی اس قدر عالمگیر ہوا کہ ایران سے ہزاروں شعرا وارد ہندوستان ہوئے، عہد اکبری اس کے لئے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، محمد مقیم الہروی (مؤلف طبقات اکبری) اور بدایونی (مؤلف منتخب التواریخ) نے تفصیل کے ساتھ سینکڑوں شعرا کے نام گنائے ہیں ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں بہت سے شعرا کا نام لکھا ہے، شیراز، کاشان، تبریز، اصفہان، لاہجان، مشہد کے شگفتہ بیان شعرا دربار اکبری کی شمع فروزاں بن گئے تھے اور ایرانی شعرا کی آمد کا یہ سلسلہ نہ صرف دہلی و لاہور تک محدود تھا بلکہ اودھ، دکن اور بہار میں بھی کثرت سے ان کی آمد رہی، حکومت کے دفاتر، ایرانی شعرا کی آمد، اور قبائل عرب کی ہجرت نے (جن کی زبان فارسی تھی) پنجاب، اودھ، دکن اور بہار پر گہرا اثر ڈالا، اور مقامی باشندوں میں فارسی زبان کا بہت پاکیزہ ذوق پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس ضمن میں سب سے پہلے شاہی دربار کی طرف توجہ کیجئے، یوں تو ہر خاندان کے مسلمان بادشاہ کے عہد میں ہندوؤں نے دربار میں رسوخ حاصل کیا لیکن دربار اکبری نے جس فیاضی کے ساتھ دربار میں ہندوؤں کو جگہ دی اس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی،

دربار اکبری کے ہندو ارباب مناصب

محمد مقیم ہروی (مؤلف طبقات اکبری) کے صاحبزادہ اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں،

"چوں تفصیل اسامی امرائے حضرت خلیفہ افاضل پناہ علامی شیخ ابوالفضل در کتاب اکبرنامہ مرقوم قلم بدایع رقم گردانیدہ اند، دریں مختصر بہ ذکر اسامی امرا

کبار اختصاص یافتہ [1]

اس کے بعد جستہ جستہ مفصلہ ذیل ہندو منصبداروں کے حالات لکھے ہیں یہ تعداد صرف ان امرار کی ہے، جو "منصب اعلیٰ" پر فائز تھے، چھوٹے چھوٹے منصبداروں کا حال اکبر نامہ میں پایا جاتا ہے،

راجہ ٹوڈر مل از طایفہ کھتری و نویسندہ بود، وبوسیلۂ مظفر خاں بہ مرتبہ وزارت رسیدہ مدت ہفدہ سال وزیر باستقلال وچہار ہزار سوار داشت"

راجہ رائے سنگھ کو بیکانیر اور ناگور کی حکومت اور چار ہزاری منصب ملا تھا، رائے سال کچھواہہ دو ہزاری رائے درکھمل ہزار و پانصدی، اور راجہ بیربر دو ہزاری امرا میں تھے، راجہ سرجن رنتھنبور میں تھا شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو اس نے اطاعت کی اور دربار کے دو ہزاری امیروں میں شامل ہوگیا راجہ روپ سی بیرا کی ہزار و پانصدی منصب رکھتا تھا۔ جگت سنگھ ولد راجہ مان سنگھ ہزار و پانصدی امرا کے صف میں تھا راجہ بہارہ مل حکومت مغلیہ کے آغاز ہی میں امرائے کبار میں شامل تھا، راجہ بھگوان داس ولد راجہ بھارت مل کو جو راجہ مان سنگھ کے باپ تھے، پانچہزاری منصب ملا تھا اس خاندان کے ساتھ اکبر اور اس کی اولاد و احفاد کو خاص لگاؤ تھا یہی وجہ ہے، کہ کئی پشت تک راجہ بھارت مل کے بیٹے پوتے اور پر پوتے دربار مغل کے امرا اور منصبداروں میں شامل تھے؛ ان پر حکومت کو کامل اعتماد تھا۔ مان سنگھ کو بہار و بنگال کی گورنری اور پانچ ہزاری منصب عطا ہوا تھا، راجہ جگن ناتھ پسر راجہ بہارہ مل اور راجہ اسکرن تین ہزاری امرا میں تھے، راجہ لونکرن بھی صف امرار میں داخل تھا، مادھو سنگھ برادر راجہ مان سنگھ دو ہزاری امیروں میں تھا، رام سنگھ ولد راجہ اسکرن سلک امرار میں تھا، اسی طرح رائے پتر داس کھتری قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور درباری منشیوں میں تھا، اس کے بعد اس کو بلاد ٹھٹھ یا تتہ کی حکومت ملی اسی طرح رامداس کچھواہہ اکبر کے حاضر باش درباریوں میں تھا' مدنی رائے چوہان، اور رائے بھوج ولد رائے سرجن ہزاری امیروں میں تھے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے، کہ جو امرا پانسو نوکر رکھتے تھے، ان پر "امارت" کا اطلاق ہوتا تھا لیکن مفصلۂ بالا امرار کا درجہ "امارت" سے بڑا تھا،

اب سوال یہ ہے کہ ان منصبداروں سے فارسی زبان کو کیا تعلق ہے؟ اس کے لئے ہمیں عہد حاضر کے

---

[1] اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے، دوران مطالعہ میں اس کتاب کے مصنف کا نام کہیں نہیں ملا، دربار اکبری کے امرا کے سلسلہ میں مؤلف نے مشکوک طریقہ سے اپنا نام لکھا ہے، لیکن ہمایوں کے سلسلہ میں انہوں نے صاف بتایا ہے، کہ اس کتاب کے مؤلف کے والد کا نام محمد مقیم ہروی ہے، ظاہر ہے، کہ محمد مقیم "طبقات اکبری" کا مصنف ہے، اس لئے یہ کتاب ایک ایسے خاندان کے فرد نے لکھی ہے، جو ایک مدت سے مغلوں کے دربار سے وابستہ تھا، اس کے اندر اکبر تک خاندان تیموریہ کا مسلسل تذکرہ پایا جاتا ہے،

والیان ریاست پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے، جن میں مشکل ہی سے کوئی ایسا نکلے گا جو انگریزی زبان سے ناواقف ہو اور اکثر تو انگریزی زبان کے ماہر ہیں اس لئے یہ ناممکن ہے، کہ دربار مغلیہ میں ہندو منصبدار حاضری تو دیتے ہوں، مگر بادشاہ اور امرا کی زبان سے نابلد ہوں، اس کے علاوہ ان میں اکثر وہ تھے، جن کو دربار سے بلاواسطہ سروکار تھا، مثلاً راجہ بھارت مل کا خاندان، رام داس کچھواہہ، راجہ لونکرن وغیرہ آخر الذکر کالڑکا رائے منوہر تو فارسی زبان کا بڑا ادیب اور شاعر تھا اور "بوسی" تخلص کرتا تھا

مسلمان اور سنسکرت و بھاشا

سنسکرت اور بھاشا کی تحصیل میں مسلمانوں نے بھی بہت بڑا حصہ لیا، چنانچہ عہد غلاماں ہی سے اس زبان کے شاعر و ادیب، افسانہ نگار دلغوی پیدا ہونے لگے، خسرو دہلوی کی پہیلیاں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، فیضی اور بدایونی نے سنسکرت سے فارسی میں بہت سی کتابیں ترجمہ کیں داراشکوہ نے سنسکرت زبان کی کتابوں، اپنشید وغیرہ کے ترجمہ پر کافی توجہ کی، اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں تو بھاشا کا ایک مستند شاعر مانا جاتا ہے، چنانچہ معتمد خاں لکھتا ہے

"خانخاناں در قابلیت و استعداد تمام عیار و یکتائے روزگار بود سواد عربی، و ترکی و فارسی و ہندی روان داشت و بہ زبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے" [1]

وہ سنسکرت زبان سے بھی واقف تھا چنانچہ ایک غریب برہمن نے اس کے دربار میں آکر کہا کہ میں اور آپ ساڑھو ہیں آپ لطف و مسرت سے بسر کریں اور میں پریشان حالی کا شکار رہوں! تو درباریوں نے سوال کیا کہ حضور یہ برہمن آپ کا ہمرلف کیونکر ہوا، خانخاناں نے جواب دیا کہ "بپتا" اور "سپتا" دو بہنیں ہیں "بپتا" (مصیبت) اس کے حصہ میں ہے، اور "سپتا" (فراغبالی) میری زوجیت میں اس سے پتہ چلتا ہے کہ بھاشا کے الفاظ اس کے دماغ میں کس طرح حاضر رہا کرتے تھے۔ [2]

اسی طرح اکبر کا ایک منصبدار حسین خاں "ٹکریہ" (متوفی ۹۸۲ھ) تھا، ٹکریہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس نے اپنی حکومت لاہور کے زمانہ میں ہندوؤں کو حکم دیا تھا کہ کاندھے کے نزدیک کرتے میں پیوند لگائیں ابن محمد معصوم المروی لکھتا ہے

وبہ زبان ہندی پیوند را ٹکری می گویند مشہور بہ "ٹکریہ" گشت [3]

چنانچہ دیہاتیوں کے پیرہن میں آج بھی یہ ٹکڑہ پایا جاتا ہے،

اسی طرح یوسف عادل خاں دکن کے عادل شاہی خاندان کے بانی کو "سوائی" کہا کرتے تھے، اس کی وجہ تسمیہ

---

[1] اقبالنامہ جہانگیری وقائع سال بستم [2] کلمات الشعرا تذکرۂ خانخاناں [3] تاریخ ابن محمد معصوم المروی تذکرہ امرائے اکبری

یہ بیان کی جاتی ہے، کہ وہ "ساوہ" کا رہنے والا تھا اس لئے عوام کی زبان میں "ساوی" کے بجائے "سوائی" ہوگیا لیکن یہ قرین قیاس نہیں صحیح یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حکام دکن میں سب سے زیادہ قوی حکمران تھا اس لئے اہل دکن اس کو "سوائی" ہندسہ کے اعتبار سے کہنے لگے، ابوالقاسم لکھتا ہے،

"ومیان شکستہ زبانان ہند بہ "سوائی" مشہور است چہ کہ سوائی بہ زبان ہندی چہار ویک رامی گویند چوں عادلشاہ بہ اعتبار ولایت وشمشیر چہار ویک بر حکام دکن زیادتی داشت بنابراں او بہ این لقب شہرت یافتہ[1]"

آگے چل کر مؤلف مذکور لکھتا ہے، کہ صحیح یہی ہے، کہ "سوائی" ساوی کی تحریف ہے، مگر میرے خیال میں "ساوی" کو سوائی کہنے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوئی اگر "سوائی" کو فرشتہ کی پہلی رائے (چہار ویک) کے مطابق مانیں تو نتیجہ نکلتا ہے، کہ کس طرح ہندی اور فارسی کا میل جول ہو رہا تھا، فیروز شاہ بہمنی کے حرم میں ہر قوم وملک کی عورتیں تھیں، ان میں راجپوت، بنگالی، گجراتی، تلنگی، کنہڑی، مرہٹی عورتیں بھی تھیں فرشتہ کہتا ہے،

وزباں آنہا ہمہ می دانست

مرزا افضل سرخوش (عہد عالمگیری) نے مسلمانوں کی ہندی اور بھاشا کی معلومات کے متعلق بہت سے واقعات درج کئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں،

"بیراگی مردے است آزاد مشرب بہ مذاق فقر آشنائی دارد پیش فقیر مشق می گذراند قصہ از کتب ہندی در زمین شاہنامہ بہ نظم راست بہ راست طرز در آوردہ مطالب تصوف را توضیح نمودہ"[2]

ملا دانا امیر خاں کی سرکار میں منشی تھے، ان کے متعلق مرزا صاحب رقم کرتے ہیں

در معنی ہندی تلاش بسیار داشت

اسی طرح عاقل خاں دہلی کے بہت نیک نیت، حق شناس، رعیت پرور، اور سخی امیر تھے، انہوں نے مثنوی روم کے طرز میں کتاب مرقع تصنیف کی اور عارفانہ کلام پیش کیا، سرخوش کہتے ہیں

گل وبلبل، وشمع وپروانہ، قصہ پدماوت، ومدہمالت را بہ نظم در آوردہ،

ملا شیدا کے ہمنشینوں میں پانی پت کے ایک شاعر تھے، انہوں نے رام وسیتا کا قصہ نظم کیا تھا، اس کے متعلق مرزا سرخوش فرماتے ہیں

ویک بیت در تعریف عصمت سیتا گفتہ کہ جمیع خوش خیالاں پشت دست گذاشتند ہیچکس قدرت ندارد کہ چنیں بیت تواند گفت وایں یک بیت بہ اعتقاد سخنوراں صاحب انصاف برابر لک بیت است (ص ۲۱۰)

---

[1] فرشتہ مقالہ ۳ [2] کلمات الشعرا ص ۲۶

و　وہ شعر یہ ہے،

تنش را پیرہن عریاں ندیدہ
چو جان اندر تن و تن جاں ندیدہ

مرزا محمد علی ماہر جیسے نباض سخن نے پہروں اس پر سر دُھنا، یہی وجہ ہے کہ اس ایک بیت کو اہل نظر نے ایک لاکھ بیت کے برابر تصوّر کیا

اس عہد کے ایک اور شاعر "نسبتی" تھانیسری تھے، یہ بھی بھاشا کے اچھے شاعر ہوئے ہیں، مرزا صاحب فرماتے ہیں

بہ زبان ہندی نیز شعر گفتہ "نسبتی" دراں تخلص می کرد، یعنی "ماہ" "نِس" بہ زبان ہند شب را گویند "بی" "آبرو" یعنی "ابروئے شب" کہ ماہ است، (ص ۲۲۵)

اس عہد کے مسلمان ادیب و شعرا نہ صرف زبان بھاشا سے دلچسپی لیتے تھے، بلکہ ہندوستانی معاشرت و رسوم بھی ان کا موضوع سخن تھے، عہد جہانگیری کا ایک شاعر "ستی" کے متعلق لکھتا ہے،

چناں مستانہ بر آتش نظر کرد
کہ از بد مستیش آتش حذر کرد،

جہانگیر شیر کے شکار کے لئے جاتا ہے، ایک شیر غراں حملہ آور ہوتا ہے، اور اس کے ایک ہندو منصبدار اتوپ کو دبوچ لیتا ہے، کشمکش شروع ہوتی ہے، اور وہ امیر بڑی بہادری کے ساتھ شیر کے پنجہ سے نکل آتا ہے، شیر مارا جاتا ہے، اور جہانگیر اپنے امیر کو "رائے سکھ دکھن" کا خطاب دیتا ہے، (اقبالنامہ وقایع سال پنجم)

عالمگیر کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے، کہ اس کا لڑکا شہزادہ محمد معظم، بادشاہ کی خدمت میں دو قسم کا آم بھیجتا ہے اور استدعا کرتا ہے کہ ان کا نام رکھا جائے بادشاہ ان کا نام "رستا بلاس" تجویز کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو رقعات عالمگیری)

(باقی)

عبدالمالک (آروی)

ضرورت ہے

نگار۔ جنوری، جون و اگست سنہ ۱۹۳۳ء کے پرچوں کی۔ اگر کوئی صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں تو اطلاع دیں۔

منیجر نگار

حُسن و عشق کی کشاکش

(تاریخ یونان کا ایک ورق رنگین)

(۱)

صنوبر ——— دیہاتی الھڑ لڑکی حسین بلا کی حسین، دیکھنے والے نے دیکھا نہیں کہ ساری کی ساری آنکھوں کی راہ بدن میں سما گئی۔ رگ رگ میں دوڑ گئی۔ کلیجہ میں اتر آئی۔ دل و جگر چھلنی ہو گئے۔ خون جوش میں آگیا۔ آنکھوں میں نور بھر گیا۔ چودہ طبق روشن ہو گئے

غارتگر دیں وہ بتِ کافر تھی سراپا۔ اللہ کی قدرت

پاری ——— ٹرائے کا نوجوان بادشاہ، شکار کھیلتا ہوا اُدھر سے گذرا۔ صنوبر پر نظر پڑی۔ سناٹے میں آگیا۔ زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ بے اختیار آگے بڑھا۔ حسینہ کے قدموں پر جھک گیا۔ وہ مسکرائی، کھلکھلا کر ہنسنے لگی، بادشاہ کی آغوش میں آگئی۔ دونوں ایک ہو گئے

حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

رات دن عاشق معشوق ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے اور یونہی ایک زمانہ گذر گیا۔ ایک دن ٹرائے کے شاہی باغ میں دونوں بیٹھے ایک دوسرے کو محبت سے تک رہے ہیں۔ صنوبر نے پوچھا:۔ "کیا سچ مچ تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو؟ اچھا قسم کھاؤ کسی اور کو نہیں چاہو گے!"

——— "میری جان! تمھارے ننھے سے دل میں یہ وسواس کیوں آتے ہیں؟ قسم تمھارے سر کی میں قیامت تک تمھارے سوائے کسی اور کو نہیں چاہوں گا۔ پیاری! یہ کیا غضب ہے کہ تم میری محبت میں اتنا شک کرتی ہو!"

——— "پیارے! یہ سچ ہے، تم مجھے ضرور چاہتے ہو۔ مگر ——— تمھاری محبت کا کیا اعتبار! کل حسن کی دیوی اسپارٹا کی ملکہ ہیلن کو دیکھ لو گے اُسے چاہنے لگو گے اور میری محبت تمھارے دل سے یک قلم کافور ہو جائے گی۔ پیارے! قسم کھاؤ تم کبھی ہیلن کو نہیں چاہو گے!"

صنوبر کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے آبدار موتی نکلے اور پھول سے رخساروں پر چمکنے لگے۔ پاری حیرت میں ہے

"ہیلن، ہیلن! — یارب یہ ہیلن کیا بلا ہے؟ الگزنڈرا بھی یہی کہتی ہے۔ کیلو پیٹرا نے بھی یہی کہا۔ اور اب تم بھی یہی کہتی ہو۔ کوئی بتاؤ کہ یہ ہیلن میں کونسا جادو بھرا ہے۔ جو دیکھتا ہے اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں ہیلن سے ضرور ملونگا دیکھوں میرا دل کیسے چھینتی ہے؟ — لو میں چلا۔ پیاری! نہ روکو، جانے دو۔ میں چلا۔ اور وہ چلا گیا"

ٹرائے سے چل کر پاری سیدھا اسپارٹا پہونچا۔ یونان کے بادشاہ مونی لس کا مہمان ہوا۔ اُسے ملکۂ حُسن وجمال بادشاہ مونی لس کی بیوی، ہیلن کی خدمت میں آسانی سے باریابی حاصل ہوگئی۔ اُس نے ملکہ کو دیکھا، ملکہ نے اُسے دیکھا۔ آنکھوں سے آنکھیں لڑیں۔ دل سے دل ملے۔ ایک ہی نظر میں تمام معاملات طے ہو گئے، بیچ کھل گئے، گتھیاں سلجھ گئیں۔ واقعی ہیلن، کچھ اور ہی چیز تھی

(۲)

بھیانک رات۔ تاریکی۔ سناٹا۔ تیز رو گھوڑے پر ایک بہادر شہسوار اور ایک پری پیکر حسینہ ہوا سے باتیں کر رہے ہیں! خوفناک دن۔ طوفان۔ شور۔ قیامت سمندر کی موجوں پر ایک نوجوان ملاح کسی ماہ طلعت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کشتی چلا رہا ہے!

یہ دونوں کون ہیں؟

طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ ہر جگہ یہی چرچا، ہر طرف یہی قصہ، یونان کی رگِ حمیت جوش میں آگئی۔ ایشیا والوں سے انتقام کی تیاریاں ہیں۔ بچہ بچہ کی زبان پر ہیلن کے اغوا کی داستان ہے۔ لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قیاس آرائیاں کرتے ہیں:— "یہ ہو نہیں سکتا! — اگر وہ خود راضی نہ ہوتی تو کس کی مجال تھی! — اور یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ راضی ہو — تو پھر اس کا بھید؟ وہ پاری کے ساتھ کیوں چل دی؟"

کارکنان قضا و قدر شوق و استعجاب سے کرۂ زمین کے مستقبل کو دیکھ رہے۔ شاید کوئی عظیم الشان انقلاب آنے کو ہے! شاید پھر زمین کا طبقۃ الٹنے کو ہے! ہواؤں میں ہیلن اور پاری کی داستان پھیلی ہوئی ہے۔ آسمانوں پر یہی چرچا ہے۔ وہ پاری کے ساتھ کیوں.....؟

جنگ چھڑ گئی! — عالمگیر جنگ۔ خونخوار، خونریز، ہولناک۔ جو پیٹر کا قہر۔ جو پیٹر کی پناہ! الامان الحفیظ! —

کچھ تاجدار اسپارٹا (یورپ) کی حمایت میں ہو گئے۔ کچھ ٹرائے (ایشیا) کی۔ برسوں لڑائی جاری رہی دو چار، پانچ چھ، سات آٹھ، دس بارہ برس گذر گئے اور جنگ کی آگ کم نہ ہوئی بڑھتی چلی گئی

آخر، تابکے؟ — ٹرائے کی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پاری مارا گیا۔ ایشیا والوں کو شکست ہوئی۔ مونی لس جیت گیا۔ فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ قتل عام شروع ہو گیا

مونی لس، ہیلن کے قتل کرنے کے لئے دیوانہ وار شاہی محل کی طرف دوڑا- اُدھر سے وہ استقبال کو نکلی! عظمت و حرمت کی دیوی! حسن و جمال کی مورت!- اس نے قاتل کی آسانی کے لئے آنچل ہٹا دیا، سینہ کھول دیا، تصویر صفت سیدھی کھڑی ہوگئی، خاموش، متین، آفتاب، ماہتاب

خونخوار شہنشاہ سکتہ میں آگیا- دم بخود رہ گیا- اس اُبھرے ہوئے سینہ کو چیروں یا اس ہنس کی سی گردن کو کاٹوں؟ ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا- قریب تھا کہ خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے- تھرتھرانے لگا- ڈر گیا- دنگ ہوگیا- ہیلن پہلے سے کہیں زیادہ حسین، کہیں زیادہ شگفتہ- حسن و عفت کی مکمل تصویر- صانع قدرت کے کمال کا مرقع- گلشن فردوس کا بہترین گلاب- اس کی عمر بڑھنے کے بجائے بارہ برس گھٹ گئی تھی- نئے سرے کم سن ہوگئی تھی- سولہ برس کی لڑکی!

کسی نے پیچھے سے کہا:— "جہان پناہ! ہاتھ روکئے!- یہ کیا غضب ہے!- جوپیٹر نے عالی جاہ کو کامیاب بنایا پاری مارا گیا- دشمن پامال ہوئے- ملکہ حسن و جمال واپس مل گئیں- اب یہ خون کیسا!- ملکہ کو ساتھ لیجئے اور اسپارٹا چلئے- آخر یہ جنگ اسی لئے تو ہوئی تھی کہ ملکہ واپس لائی جائیں!

مونی لس چپ تھا- یہ جنگ کیوں ہوئی؟ یہ عظیم الشان جنگ؟ بارہ برس کی مسلسل جنگ؟ کیا اسی لئے کہ ہیلن واپس لائی جائے! شاید!- مگر میں تو یہ نہیں سمجھا تھا- کہیں کوئی اور مقصد نہ ہو! کچھ یاد نہیں آتا- شاید!

..... مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟..... نہیں

(۳)

گناہ، بالجبر، بدترین، ارزل ترین، اسفل ترین- سپاہ سالار اعظم "ٹی ٹس" نے زیادتی کی- خود خداوند قدوس کے حضور، خود خداوند جوپیٹر کے مندر میں، محراب کے پاس، مورت کے سامنے، دن کے وقت، الگزنڈرا پاری کی بہن..... صاف، صریح، ظلم عظیم- اثم کبیر

ٹی ٹس کا بیان ذرا مختلف ہے- وہ کہتا ہے عبادت گاہ میں اُس وقت خداوند کی مورت موجود نہ تھی- لہٰذا مجھ پر خداوند کی توہین کا الزام غلط ہے- مگر اس کی حجت مسموع نہ ہوئی اور خداوند جوپیٹر کی توہین کی پاداش میں اُسے پھانسی کی سزا دیدی گئی- نیز اسی معصیت کے کفارہ میں لگاتار چالیس دن تک روز ہو سو بکروں کی قربانی کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری سمجھا گیا- تمام فاتح تاجداروں کی یہی رائے تھی- صرف بادشاہ مونی لس اس رائے سے متفق نہ تھا

مونی لس نے کہا:- ٹی ٹس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے جلدی کی، اگر ایک روز ٹھہر جاتا تو الگزنڈرا بطور لونڈی کے اس کے حوالہ کردی جاتی اور کوئی گناہ نہ ہوتا- اب ٹی ٹس مارا جا چکا ہے- قربانیاں بھی تھوڑی بہت ہو چکی ہیں، لہٰذا اب اس اُجڑے ہوئے شہر میں پڑے رہنا اور قربانیوں کا سلسلہ جاری رکھنا، مناسب نہیں- اگر خداوند جوپیٹر کو اس شہر کی بے حرمتی منظور نہ ہوتی تو یہ شہر ویران نہ ہوتا، لوٹا نہ جاتا- میں اتنی لمبی قربانیوں کا قائل نہیں ہوں

میرے نزدیک یہاں رکنا بے سود ہے

بادشاہ آگونس نے جواب دیا :- تم اس گناہ کا احساس نہیں کر سکتے ! تمھارے گھر کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ ہیلن کو دیکھو کتنوں نے اُسے شکار کیا اور کتنوں کو اس نے شکار کیا ! تم ٹرائس کے گناہ اور خداوند قدوس کی توہین کا کیونکر تصور کر سکتے ہو ! اپنا فلسفہ پاس رکھو۔ قربانی کے فرائض رُک نہیں سکتے !

مونی لس ——— میں یہ منطق سمجھنے سے قاصر ہوں

آگونس ——— اچھا، تو تم چلے جاؤ۔ اور اپنا لشکر ساتھ لے جاؤ۔ ہم اور ہماری فوجیں یہیں ٹھیریں گی

مونی لس ——— میں کل روانہ ہوں گا

خداوند جوپیٹر کے مندر میں منبر کی سیڑھیوں پر ہیلن کھڑی قربانی کے فرایض انجام دے رہی ہے۔ اس کی روشن پیشانی پر پسینہ کی بوندیں جھلک رہی ہیں۔ سامنے مقدس آگ جل رہی ہے جس میں وہ آہستہ آہستہ گھی ڈال رہی ہے۔ راہب جوپیٹر کی حمد گا رہے ہیں۔ آگ کی گرمی سے ہیلن کا رنگ سرخ ہو رہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کی نگاہیں خداوند جوپیٹر کے بجائے اسی حسن کی جیتی جاگتی مورتی کی پوجا کر رہی ہیں۔ جوپیٹر کی مورت پر کسی کی بھی نظر نہیں۔ البتہ ہیلن اسی خداوند قدوس کے مقدس سونے کے پتلے کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی عبادت ہے ریا، بے غیب، بے ریا ہے۔ شام ہوگئی اور ہیلن پہلے دن کی قربانی کے فرائض انجام دے چکی۔ اب انتالیس دن اور باقی رہ گئے

رات کے وقت ہیلن اور مونی لس میں باتیں ہو رہی ہیں

مونی لس ——— ہم کل اسپارٹا روانہ ہوں گے

ہیلن ——— ایں !- اتنی جلدی !- اور قربانیاں !

مونی لس ——— کیا اب بھی جلدی ہے ! تم ٹھہرنا چاہو تو شوق سے ٹھہرو

ہیلن ——— نہیں - میرے لئے تو ہر جگہ برابر ہے۔ ٹرائے ہو یا اسپارٹا - یورپ ہو یا ایشیا - البتہ سپاہیوں کے احساس کا خیال ضروری ہے - ان کے دلوں سے قربانی کی اہمیت کیونکر دور کی جا سکتی ہے !- اور پھر جیسا تم مناسب سمجھو - تعجب ہے کہ میرے تعاقب میں تو اتنی جلدی نہیں کی گئی تھی - اور قربانی کی تمام رسمیں ایک ایک کر کے ادا کی گئی تھیں - حالانکہ وہ جلدی کا محل تھا نہ کہ اب - میرے خیال میں قربانی کی رسمیں ادا ہو لیں تو چلیں - اس کے علاوہ لشکری سب بہت تھک بھی گئے ہیں - تھک کے چور ہو گئے ہیں - انھیں کچھ دنوں کے لئے آرام مل جائے گا - لشکریوں کو ناخوش کرنا مصلحت کے خلاف ہے - کہو ! تم کیا کہتے ہو ؟

مونی لس ——— خدا ہماری قربانیوں کا بھوکا نہیں - آگونس اور اس کے ساتھی یہاں بیٹھے قربانیاں کرتے رہیں گے - میں اپنے لشکر کے ساتھ کل روانہ ہو جاؤں گا

ہیلن ——— میرے خیال میں تمھارا بھائی آگمنن حق پر ہے اور تم غلطی پر ہو

مونلس ——— شاید میرا دماغ چل گیا ہے۔ مگر میں صبح روانہ ہوں گا۔ تم چلوگی یا نہیں ؟

ہیلن ——— میں چلوں گی

(۴)

کشتی ڈول رہی ہے اور ہوا مخالف ہے۔ ہیلن کی زلفوں سے تیز ہوا کے جھونکے بدمستیاں کر رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں دور سمندر کی حد پر گڑی ہوئی کتاب شفق کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر، سمندر کے تلاطم سے بے پروا، زمانہ کی نیرنگیوں سے بے فکر، کسی اور ہی عالم میں مدہوش ہے۔ سپاہی بار بار اس کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں :——" اگر یہ آسمانوں کی دیوی ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو کشتی ڈوب جاتی اور ہم سب مرجاتے۔ بھلا خداوند جو پیٹر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے ! "

ہیلن نے کروٹ بدلی۔ ملاحوں کے ہاتھ خود بخود رُک گئے۔ سب ہمہ تن گوش ہوگئے۔ وہ کہنے لگی :—

" ہم کہاں جا رہے ہیں ؟ "

مونلس :——— اسپارٹا !

ہیلن ——— نہیں۔ یہ اسپارٹا کا آسمان نہیں ہے

کئی ہفتے گذر گئے اور شاہی بیڑا اسپارٹا نہ پہنچ سکا۔ ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ سامان رسد بھی ختم ہوگیا۔ چاروں طرف ہلاکت ہی ہلاکت نظر آنے لگی۔ بڑی مدت کے بعد آسمان پہ کچھ عرغابیاں دکھائی دیں۔ پھر کنارہ نظر آیا۔ مونلس چلا اٹھا :۔ "ہیلن! وہ دیکھو! اسپارٹا کا ساحل آگیا ! "

ہیلن نے کہا :——" نہیں یہ اسپارٹا کا ساحل نہیں۔ کوئی اور بستی ہے "

وہ اسپارٹا نہ تھا۔ مصر کی زمین تھی۔ کشتی رُکی تو سب سے پہلے ہیلن بے دھڑک کنارہ پر اُتر آئی۔ لبِ ساحل شاہی خیمے نصب ہوگئے۔ مصر میں اک دھوم مچ گئی۔ " ہیلن آئی ! ہیلن آئی ! جنگِ عظیم کی دیوی ! حسینانِ عالم کی رانی ! معشوقانِ جہاں کی ملکہ ! "۔ مصر والے حیرت میں تھے۔ یہ کوئی بشر ہے، یا حور ہے، یا پری ہے، یا آسمان کا تارہ !

ہیلن کو مصر کی سرزمین بہت پسند آئی۔ اس نے اپنے خاوند سے کہا :۔ یہ کیسی حیرت انگیز زمین ہے ! یہاں کی ہر چیز بے نظیر، بے عدیل، بے بدل ! میں تو کہتی ہوں کہ تہذیب و تمدن میں بھی مصر، اسپارٹا اور ٹرائے دونوں سے بڑھ کر ہے

مونلس ——— مجھے اتنی فرصت نہیں کہ یہاں کے تمدن کا اپنے تمدن سے مقابلہ کروں۔ ہمیں چاہیئے کہ جلد سے جلد تمام سامان رسد فراہم کرلیں اور چل نکلیں ! میرے لئے ایک ایک منٹ پہاڑ ہو رہا ہے

ہیلن ——— اور قربانیاں !

مونی لس ——— کیسی قربانیاں ! قربانیاں قطعاً غیر ضروری ہیں۔ ہمیں چلنے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے !

ہیلن ——— قربانیاں بہت ضروری ہیں۔ کیونکہ ہمارے ساتھی بددل ہو رہے ہیں

مونی لس ——— تم انھیں بددل نہیں کروگی تو وہ بددل نہیں ہوگے۔ تم چلنے کو تیار ہو ؟

ہیلن ——— میں تیار ہوں

رات کو مونی لس اپنی چادر کے اندر ایک بھیڑی کا بچہ چھپا لایا۔ اس نے بچہ خداوند جو پیٹر کی تصویر کے سامنے ذبح کر دیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر دعائیں مانگنے لگا۔ دیر تک دعائیں مانگتا رہا۔ ہیلن جاگ رہی تھی۔ دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔ اور خاموش پڑی رہی

چند روز بعد کشتیاں روانہ ہوئیں اور ہوا پھر مخالف ہو گئی۔ نہ معلوم مونی لس کے نصیبوں میں کیا لکھا تھا۔ تند ہوا، پُرشور سمندر، بددل ملاح، ہر طرف ناکامی ہی ناکامی کا سامنا تھا۔ دوسرے دن کشتی جزیرۂ مردہ کے ساحل پر جا لگی۔ پھر ہیلن جلدی سے خشکی پر اُتر آئی۔ مونی لس حیران تھا یہاں اترنے کا حکم کس نے دیا۔ اور کب دیا ؟ مگر وہ خاموش رہا کیونکہ سپاہی بددل تھے اور سمندر میں تلاطم تھا

ہیلن اس شور بنجر زمین میں بھی چاروں طرف گشت لگایا کرتی۔ یہاں نہ کوئی آدم نظر آتا نہ آدم زاد۔ نہ پینے کو پانی نہ کھانے کو دانہ۔ سمندر کی شوریت نے جزیرہ کی مٹی کو زہریلا بنا دیا تھا

کئی ہفتے گذر گئے۔ پھر سامان رسد گھٹ گیا۔ اور سپاہی بھوک سے پریشان ہونے لگے

مونی لس نے ہیلن سے کہا :—— "مصر واپس چلنا چاہیئے۔ ورنہ یہاں سب بھوک سے مر جائیں گے۔ مصر یہاں سے ایک ہی دن کے فاصلہ پر تو ہے" ——— ہیلن نے جواب دیا :—— "یہاں ایک دن بھی رُکنا مناسب نہ تھا تعجب تم اتنی مدت کیوں ٹھہرے ؟"

اسی وقت چند پریشان حال سپاہی اجازت لے کر خیمہ کے اندر داخل ہوئے اور کہنے لگے :—

"جہاں پناہ ! ہم نے ہمیشہ وفاداری سے آپ کا ساتھ دیا۔ مگر اب مجبور ہیں ساتھ دے نہیں سکتے۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں۔ آخر ہمیں کس جُرم کی سزا میں یہاں قید رکھا گیا ہے، جہاں نہ دانہ ہے نہ پانی۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ نہ چرند نہ پرند" ——— مونی لس ——— ہم مصر جانیکا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جاؤ تیار ہو جاؤ !۔ آج دوپہر سے پہلے لنگر اٹھ جائیں !۔ جلدی کرو جاؤ کیوں نہیں جاتے ؟ کیا کھڑے ہو ؟ کیا کہتے ہو ؟ کچھ اور کہنا ہے ؟ بولو ؟

"جہاں پناہ ! قربانیاں ! ———

(باقی آیندہ)

(ترجمہ) محمد اسحاق (امرتسری)

انگریزوں کی آئینی آزادی

یوں تو ہر انگریز بادشاہ کا ماتحت ہے اور اس لحاظ سے اس کو انگلستان کی رعیت کہا جا سکتا ہے لیکن فی الحقیقت تمام شہری حقوق (Rights of Citizenship) جو کسی آزاد سے آزاد ملک میں لوگوں کو حاصل ہیں وہ اس کو بھی حاصل ہیں اس لئے اس کو اپنے ملک کا (Citizen) کہنا چاہیئے۔ بادشاہ سے اس کا تعلق قدیم نظام جاگیری (System . . . .) کے زمانہ سے ہے۔ لیکن وہ تعلق اس قسم کا ہے کہ وہ قومیت کے ترقی میں معین ہے اور (Citizenship) کے حقوق میں حائل نہیں ہے۔ اس کے اور عمدہ نتائج نظر انداز کر کے بھی آئینی اعتبار سے ایک نتیجہ اس کا یہ ہے کہ بادشاہ کو تسلیم کرنے کے بعد ہر شخص کو انگلستان میں رہنے سے تمام حقوق برٹش رعایا ہونے کے ہو جاتے ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر جب (Hanover) ہینور خاندان کا بادشاہ جارج اوّل تخت نشین ہوا تو (Hanover) جو جرمنی میں ہے وہاں کے لوگوں کو پارلیمنٹ میں بیٹھنے اور ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا۔ یہ قضیہ ایک معرکۃ الآرا مقدمہ میں اس وقت طے ہوا جبکہ یہ سوال اٹھا کہ بادشاہ جبکہ انگلستان کا تاج پا گیا ہو تو وہ بچہ جو (Edinburgh) میں پیدا ہوا ہو وہ تخت پا سکتا ہے یا نہیں اور آیا وہ ملکی یا غیر ملکی سمجھا جاوے گا۔ اس مقدمہ میں یہ طے پایا کہ وہ ملکی سمجھا جاوے گا۔ اس طرح انگلستان میں صرف ایک چیز جو ضروری ہے وہ بادشاہ کو تسلیم کر لینا ہے۔ اس کے بعد آدمی آدمی کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ جاتا اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا وہ پارلیمنٹ وغیرہ کا ممبر اور ووٹر بن سکتا ہے۔ وہ میونسپل ووٹر بھی بن سکتا ہے۔ سول یا ملٹری ملازمت حاصل بھی کر سکتا ہے اور بہ استثنا چند حالتوں کے جلاوطن نہیں ہو سکتا لیکن یہ واضح رہنا چاہیئے کہ غیر ملکی کو بھی انگلستان میں چند حقوق حاصل ہیں۔ حالانکہ یہ پہلے نہ تھے۔ مثلاً ایک غیر ملکی وہاں زمین حاصل کر سکتا ہے۔ اور وراثتاً بھی زمین پا سکتا ہے اور بعض پیشوں کو بھی حاصل کر سکتا ہے مثلاً وہاں ڈاکٹر یا بیرسٹر ہو سکتا ہے

فرانس اور امریکہ میں اس قسم کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ اور چونکہ وہاں کسی بادشاہ کی اطاعت وغیرہ لازم نہیں ہے اس لئے (Citizenship) کے حقوق پر وہاں بہت اہمیت دی جاتی ہے اور آزادی پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ ایک نقص اون کے نظام میں یہ ہے کہ جب کوئی نیا ملک امریکہ یا فرانس کے تحت میں ہوتا ہے تو وہ ایسے کسی مرکز کو نہیں پاتا جس کی طرف وہ رجوع کر سکے۔ جیسا کہ برٹش رعایا بادشاہ سے بہ آسانی رجوع کر سکتی ہے۔ دیگر ممالک میں وہ حقوق بھی غیر

ملکیوں کو حاصل نہیں ہیں جو انگلستان میں غیر ملکی برٹش رعایا کو حاصل ہیں مثلاً (Philippines) کے امریکہ کے تحت میں ہونے کے باوجود وہاں کے باشندوں کو امریکہ میں (Citizenship) کے حقوق حاصل نہیں ہو سکتے اسی طرح گو الجیریا (Algiers) کے مسلمان فرانس کے ماتحت ہیں لیکن اون کو فرانس میں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ہر برٹش رعایا کو صرف (British Citizenship) نہیں بلکہ (British Nationality) کے بھی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں

عام طور پر (British Nationality) کے حقوق حسب ذیل وجوہ پر حاصل ہو سکتے ہیں :—

(۱) کسی برٹش ڈومینین (نوآبادی) یا برٹش جہاز پر پیدا ہونے سے

(۲) باپ کے برٹش ہونے سے

(۳) اس ملک کا باشندہ ہونے سے جو سلطنت برطانیہ میں شامل ہو جائے

(۴) (Certificate of Nationalisation) حاصل کر لینے سے

(۵) کوئی عورت اگر کسی برٹش سے شادی کرے تو یہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں

انگلستان کے..... آئین کے اعتبار سے آزادی کو تین مختلف طریقہ پر تقسیم کیا جا سکتا ہے

اوّل۔ پارلیمنٹ کی آزادی اور تاج کے حدود

دوم۔ باشندگان ملک کی روزانہ زندگی میں مداخلت کی کمی

سوم۔ قانونی شیرازہ بندی کی وسعت

نمبر اول و دوم کے متعلق یہاں لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ پارلیمنٹ۔ تاج۔ اور قانونی فضیلت پر جو کچھ پہلے لکھا گیا ہے۔ اس سے اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہاں پر صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ ایک انگریز اپنے طرز نظام کے ہر رُخ اور ہر شعبہ میں اپنے دماغ۔ جسم اور جائداد کی کامل آزادی چاہتا ہے۔ اور اسی کو نظام کا بنیادی اصول سمجھتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے مُلک کے نظام میں اُس کے لئے شکنجے اور حدود نہیں ہیں۔ وہ تو موجود ہیں لیکن وہ ان کو فطری اصولِ نظم و تنظیم سے آگے تجاوز ہونے دینا نہیں چاہتا

نمبر ۳ کے ضمن میں خاص طور پر دو باتیں شامل ہیں۔ آزادی نقل و حرکت و آزادی تقریر

قدیم زمانہ میں بادشاہ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اپنی رعایا میں سے جس کو چاہتا گرفتار کر سکتا اور قید کر سکتا تھا۔ لیکن (Habeas Corpus Act) یعنی " قانون لزوم تحقیقاتِ محبوس " نے جو ۱۶۷۹ء میں پاس

ہوا بادشاہ کے اس اختیار کا قلع قمع کر دیا۔ اس ایکٹ کی رُو سے تمام برٹش رعایا ہر قسم کے حبس بے جا سے محفوظ رکھی گئی ہے۔ گورنمنٹ کا کوئی افسر کسی شخص کو بے جا قید نہیں کر سکتا۔ اور اگر گورنمنٹ یا کوئی افسر یا کوئی معمولی آدمی کسی کو حبس میں رکھے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس اصول کا نفاذ تو بہت پہلے سے تھا لیکن یہ ایکٹ اس وقت پاس ہوا جبکہ پریوی کونسل نے ایک شخص مسمی فرانسس جنکنس (Francis Jenkins) کو ایک سیاسی تقریر کی وجہ سے قید کر دیا تھا۔ اور اس فیصلے کے خلاف کوئی عدالت اور جج سننے کو تیار نہیں ہوتا تھا

اسی ایکٹ کی رُو سے رعایا کو یہ بھی حق دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص فوجداری کے کسی جرم میں قید کیا جائے یا حوالات میں بند کیا جاوے تو اس کی طرف (Lord Chancellor) یا جج کو عرضی دی جا سکتی ہے کہ (Habeas Corpus) کے ذریعے اُس افسر کو حکم دیا جاوے جس نے اوس کو محبوس کر رکھا ہے کہ وہ فوراً عدالت میں اس کو حاضر کرے۔ اس حکم کے جاری ہوتے پر جج کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ دو دن کے اندر اس کو بلا ضمانت یا ضمانت پر چھوڑ دے۔ اگر جج ایسا نہ کرے تو پانچسو پونڈ تک جرمانہ کا مستحق ہوگا

اس قانون کو ۱۶۸۸ء کے (Bill of Rights) نے اور بھی مضبوط کر دیا کیونکہ اس سے بہت بھاری ضمانت طلب کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ ۱۸۱۶ء کے ایکٹ نے اس قانون کی وسعت کو اور بڑھا دیا کیونکہ اس ایکٹ کی رُو سے علاوہ فوجداری کے جرائم کے اور کسی قسم کی گرفتاری اور قید پر بھی یہ ایکٹ نافذ تھا

یہ ایکٹ ایسی کارروائیوں میں دخل نہیں دیتا جو جائز ہیں۔ مثلاً قانون فوجداری کی رُو سے بعض دفعات کے تحت میں ملزم کی گرفتاری جائز ہے۔ اسی طرح عدالت عالیہ کے ججوں کو توہین عدالت کرنے میں ملزم کو قید کرنے کا اختیار ہے پارلیمنٹ بھی خاص صورتوں میں بعض لوگوں کو قید کرنے کی مجاز ہے۔ جنگ کے زمانہ میں (Defence of the Realm Act) کے ذریعے سے کچھ اختیارات قید کرنے کے اور نقل و حرکت روکنے کے حاصل کئے گئے تھے۔ ایسی صورتوں میں (Habeas Corpus Act) کا نفاذ نہیں ہو سکتا

اگر ایک شخص اپنی بیوی کی آزادی کو قطعی روک دے سوائے اس حالت کے جبکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگنے والی ہے تو (Habeas Corpus) کی کارروائی اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ اس ایکٹ کی کارروائی کرنے کا حق صرف بادشاہ کی رعایا ہی کو نہیں بلکہ اوروں کو بھی حاصل ہے۔ یہاں پر ایک مقدمہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا (James Somerset) ایک حبشی غلام تھا۔ وہ (Virginia) سے ۱۷۷۲ء میں انگلستان لایا گیا۔ وہ اپنے مالک کے پاس سے بھاگ گیا۔ مگر گرفتار کر کے ایک جہاز پر بٹھایا گیا۔ اس غلام کی طرف سے (Habeas Corpus) کی کارروائی کی گئی اور جب جہاز واپس آیا تو لارڈ مینس فیلڈ (Lord Mansfield) جو اس وقت (Chief Justice)

تھے یہ فیصلہ کیا کہ غلام، ننگ تہذیب و تمدن ہے اور کوئی چیز غلامی کی حامی نہیں ہو سکتی - چنانچہ وہ رہا کر دیا گیا - اُنھوں نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ انگلستان کی فضا غلامی کے تخیل کو برداشت نہیں کر سکتی - شاید ہمارے ہندوستانی بھائی اس مسئلہ کو ایک حال کے واقعہ سے زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے - ہمارے ایک دوست حال میں ایک نوکر اپنے ساتھ ولایت لے گئے - انگلستان میں نوکر اور مالک میں وہ امتیاز نہیں ہے جو یہاں ہے - وہاں اس کے ساتھ سفر کرتا کھانا کھانا عیب نہیں ہے بلکہ (Please & Thanks) کا لفظ جیسا اوروں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اس کے ساتھ بھی ہر وقت استعمال کیا جاتا ہے - چنانچہ جب ایک بہت بڑے پنشن یافتہ افسر نے جو ہندوستان میں بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ بھی امتیازی برتاؤ کرتے تھے جب ان کی دعوت کی تو نوکر کو بھی اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور اپنے داہنے ہاتھ پر موٹر میں بٹھا کر سیر کروائی - ہندوستان میں اس کے خلاف جو نوکر کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہے وہ سب پر روشن ہے

فرانس میں بھی سنہ ۱۷۳۸ء ایک اس قسم کا مقدمہ ہوا تھا - اس میں بھی غلام کے موافق طے پایا تھا - لیکن امریکہ کا آئین کچھ اور کہتا ہے - وہاں کے آئین کے الفاظ یہ ہیں کہ " جو آدمی کسی خدمت یا مزدوری کے لئے مقرر کیا جاوے اور وہ بھاگے تو وہ چھوڑا نہیں جائے گا بلکہ وہ اس مالک کے حوالے کیا جائے گا - جس کی مزدوری وہ کرتا تھا - قانون کی یہ بندش انگلستان کے مندرجۂ بالا مقدمہ ہی کی وجہ سے ہوئی اور اس سے دونوں اقوام کے تخیل کی روش معلوم ہوتی ہے

آزادی تقریر یا تحریر آزادی کا سب سے اہم جزو ہے - اسی حق آزادی کے ذریعہ سے انسان اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے - اور اخلاقی تمدنی و سیاسی اصولوں کی تبلیغ کر سکتا ہے - تہذیب کے ارتقا میں اس آزادی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے اور جن اقوام نے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں کیا وہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں

انگلستان میں یہ حق دو چیز سے حاصل ہے

(۱) (Rule of Law) یا آئینی دستور

(۲) آزادی کا وہ قومی جذبہ جو قوم کے آئینی ضمیر کو ہمیشہ جلا دیتا رہتا ہے

اگر ان دونوں اصولوں کے فلسفہ پر پورے طور سے غور کیا جاوے تو معلوم ہو جائے گا کہ انگلستان نے اپنے باشندوں کو تقریر و تحریر کی پوری آزادی دی ہے مگر اُسی کے ساتھ قانون کے ذریعہ سے آزادی کو اسقدر منظم کر دیا ہے کہ یہ آزادی بیجا طور پر استعمال نہیں ہو سکتی - وہ لوگ مُلک کے فائدہ کے لئے ہر طرح کی نکتہ چینیاں کر سکتے ہیں لیکن اوسی کے ساتھ کسی کو بے جا طور پر ذلیل نہیں کر سکتے - اور نہ کسی کو بے جا نقصان پہونچا سکتے ہیں (Lord Irano field)

لکھتا ہے کہ پریس کی آزادی اس پر منحصر ہے کہ کسی چیز کی اشاعت کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہ ہو لیکن قانونی نتائج نظر سے فروگذاشت نہ کئے جاویں

ایک اور انگریز ماہر آئین لکھتا ہے " ہمارا موجودہ قانون ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جو جی چاہے کہے۔ لکھے اور شائع کرے۔ لیکن اگر وہ اس آزادی کا بے جا استعمال کرے تو موجب سزا ہوگا۔ اگر وہ کسی شخص پر بے جا حملہ کرے تو دوسرا شخص نقصان کا دعوے کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی چیز لکھے اور شائع کرے جس سے بد اخلاقی پیدا ہو یا بغاوت پھیلے تو بد اخلاقی اور بغاوت کے جرم میں سزایاب ہو سکتا ہے " اسی آزادی کی اہمیت کے تحت میں بعض ایسے مستثنیات ہیں جن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً پارلیمنٹ میں جو کچھ کہا جائے یا عدالتی کارروائیاں یا وہ خطوط وغیرہ جو درمیان وزرا کے یا وزرا اور بادشاہ کے ہوں یا وہ کاغذات جو پارلیمنٹ کے حکم سے شائع کئے جاویں یا صحیح رپورٹ عدالتی کارروائی کی لیکن ان مستثنیات کے قائم کرنے میں بھی لوگوں کے حقوق کے لحاظ سے چند بندشیں رکھی گئی ہیں۔ مثلاً جہاں پارلیمنٹ کی تقریر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی وہیں اس تقریر کی اشاعت پر قانونی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ یا مثلاً بغاوت کا قانون تو یہ کہتا ہے کہ جو شخص ایسے الفاظ استعمال کرے۔ جس سے بادشاہ کی توہین ہو یا اس کے خلاف تنفر پیدا کرے یا کسی قسم کی شورش برپا کرے تو وہ سزایاب ہوگا لیکن عام طور پر مقدمہ اس وقت تک نہیں چلایا جاتا جب تک کہ نقص امن کا بے حد خطرہ نہ ہو دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ (Bacon) کے الفاظ کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ " ذہانت کو سزا دینا فی الحقیقت اس کی قوت اور تیزی کو بڑھانا ہے اور ضبط شدہ تحریر کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں کچھ چنگاری سچ کی ضرور ہے جو اون کے چہرہ پر لگتی ہے جو اس کو دبانا چاہتے ہیں "

ماحصل یہ ہے کہ انگریزی آئین اپنی قوم کو نظم کے دائرہ میں رکھ کر اون کی روح کو تازگی بخشتا ہے۔ اون کے دماغ کو منور کرتا ہے۔ اور اون کے جسم کو قوت دیتا ہے۔ اوس کے ذریعہ سے اونھیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ اور اون کے حقوق کا کامل تحفظ ہے

ایس۔ ان۔ جعفری

دو ادبی شاہکار

شوپنہار۔ فلسفۂ شوپنہار پر ایک بےمثل تبصرہ عہ ر (علاوہ محصول)

مثنوی زہر عشق۔ مجلد معہ رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت عہ ر (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

تاریخ ہند کا ایک ورق

بندھیلکھنڈ کا موتی

(دو ایکٹ کا مختصر ڈرامہ)

ایکٹ اوّل ——— پہلا منظر

(تاریک رات ہے اور جمنا ندی چٹانوں اور سنگ ریزوں سے ٹکرا ٹکرا کر رات کی تاریکی کو اور بھی بھیانک بنا رہی ہے۔ ندی کے داہنی جانب ساحل پر ایک ٹیکرا ہے۔ جس پر ایک بہت پرانی گڑھی قائم ہے فصیلوں پر گھاس اور کائی سے ایک خاص ہیبت پیدا ہو گئی ہے جس کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہیبت معلوم ہوتی ہے۔ اندر گڑھی کے ایک دالان میں سارندہ اور سیتلا دیوی بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہیں)

سیتلا دیوی۔ پورے تین برس ہو گئے کہ پران ناتھ کو چین سے بیٹھنے کو نہیں ملا، رام جانے وہ کون لوگ ہیں جنکے دن آرام سے کٹتے ہوں گے

سارندہ۔ (چونک کر) کیوں، سیتلا، کیا ہوا؟ کیا بھیّا کے راج میں تم کو سُکھ نہیں ملا

سیتلا دیوی۔ نہیں، ایشور نہ کرے کہ میں ایسی چنتا کروں پر تو ———

سارندہ۔ بولو سیتلا بولو چھپانے کا کام نہیں تم راجپوتنی بھی ہو اور راجپوت کی بیوی بھی۔ تم کو کوئی بات چھپانا نہ چاہئے

سیتلا دیوی۔ تم خفا ہو گی۔ اور سوامی بھی اگر سنیں گے تو خفا ہوں گے اس لئے اب نہ پوچھو، جانے دو

سارندہ۔ ٹالو نہیں، اب میں بغیر پوچھے نہ رہوں گا اور تمھیں بتانا پڑے گا

سیتلا دیوی۔ میں نے کتنی بار ان سے بنتی کی پاؤں پڑی کہ میری آنکھوں کے سامنے سے کہیں نہ جاؤ مجھے ہردوار لے چلو بندرابن لے چلو۔ اجودھیا کے درشن کرا لاؤ، رسی کیس، پریاگ بدری ناتھ لے چلو۔ اپنے ساتھ جنگل میں رکھو۔ مگر یہ بیوگ کسی طرح نہیں سہا جاتا کہ پہاڑوں ویرانوں میں اپنی جان دیتے پھرو۔ پر نتو میں قسمت کی ہیٹی ہوں کہ میں کسی ہتیار سے سوامی کے دل پر قابو نہ پا سکی

سارندہ۔ (زہر خند کر) کیا سیتلا دیوی تم چاہتی ہو کہ بھیّا بندیلو

کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ لگا دیں کیا تمہاری رنواس کی خاطر
وہ اپنا نام میٹ دیں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ دشمنوں سے
لڑنے کی جگہ تمہاری سیوا کے لئے محل میں بیٹھے رہیں ——
(غصہ سے) تم کو کیا معلوم کہ اس وقت کیا حال ہے، اور
دشمنوں نے کیسا گھیر رکھا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ چوڑیاں
پہنکر بیٹھ جائے۔ یاد رکھنا سیتلا دیوی ایشور نہ کرے اگر
دشمن جیت گئے تو تمہاری لاج کی خیر نہیں ——"

(دروازہ کھلتا ہے اور ایک طویل القامت نوجوان اندر داخل ہوتا ہے)

سیتلا۔ (خوشی سے اُچھل کر) سارن۔ لو وہ آگئے

سارن۔ (متفکرانہ انداز میں) بھیا۔ یہ کپڑے کیسے بھیگے ہیں؟ کیا پانی برسا ہے؟

انردھ۔ نہیں، ندی پار کرکے آیا ہوں

سیتلا۔ ایشور نے بڑی خیر کی آج کل ندی باڑھ پر ہے

سارن۔ ہتھیار کیا ہوئے؟

انردھ۔ چھن گئے!

سارن۔ اور ساتھی!

انردھ۔ کام آگئے!

سارن۔ (سیتلا کی طرف دیکھ کر) سیتلا، یہ سب تمہارے کارن ہوا۔ تم نے کنبہ کی ناک کٹوا دی۔ اب تو کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی

انردھ۔ نہیں اس میں سیتلا کا قصور نہیں ہے۔ خود میں نے دھوکا کھایا

سارن۔ تو بھیّا، شاباش ہے تم کو۔ کہ پُرکھوں کی ناک کٹوا کر اپنی صورت دکھانے یہاں آئے ہو، راجپوت تو باپ دادا کی آن کبھی نہیں کھوتے،

(انردھ کچھ دیر تک سوچتا رہتا ہے اور پھر باہر چلا جاتا ہے۔ سیتلا پیچھے پیچھے جاتی ہے انردھ کو پکارتی ہے۔ لیکن انردھ فصیل کی دیوار پھاند کر رات کی تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے۔ اور سیتلا چٹان پر بیٹھ کر رونے لگتی ہے)

سارن۔ سیتلا کہاں ہو

سیتلا۔ یہاں اپنی قسمت کو رو رہی ہوں

(سارن بھی جاتی ہے)

سارن۔ کیوں روتی ہو!

سیتلا۔ (ناگن کی طرح بل کھا کر) کیا باپ دادا کی آن اتنی پیاری ہے

سارن۔ (غصہ سے تیور اکر) ہاں، ہے

سیتلا۔ اپنا پتی ہوتا تو کلیجہ میں بٹھا لیتیں

سارن۔ کلیجہ میں۔ بالکل جھوٹ۔ تلوار جھبو دیتی

سیتلا۔ (غصہ سے) جھوٹ۔ ڈولی میں چھپاتی پھروگی۔ خیر، دیکھا جائے گا۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات!

دوسرا منظر

(سارندہ سیتلا دیوی آپس میں مصروف گفتگو ہیں)

سیتلا۔ آج پورے ۳ مہینے ہو گئے مگر کچھ خبر نہیں ملی

سارندھ۔ شیر کچھار میں ہوگا۔ خبر کیا ملتی

سیتلا۔ سارن۔ تم نے اُس رات بہت رولایا

سارن۔ لیکن پُرکھوں کی آتماؤں کو خوش کیا

سیتلا۔ (چونک کر) سارن۔ یہ سنکھ کی آواز کہاں سے آرہی ہے

سارن۔ (کان لگا کر) ہاں راجپوتی آن پر جان دینے والا

راجہ انردھ سنگھ آگیا - مبارک ہو

سیتلا (دور سے) کہاں - کہاں

(آواز اور قریب ہوتی جاتی ہے)

سارن - ضرور، میرا دل بول رہا ہے کہ ہونہ ہو وہی ہیں

سیتلا - ایشور ایسا ہی کرے

(دروازہ کھلتا ہے اور انردھ سنگھ داخل ہوتا ہے)

سیتلا - پران ناتھ ——— (قدموں پر گر پڑتی ہے)

سارن - بھیّا - بھیّا

انردھ سنگھ - سارن میں مہروٹی کا قلعہ فتح کرکے آرہا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر چکا ہوں کہ راجہ چمپت رائے بندیلہ کے ساتھ تمھارا بیاہ کر دیا جائے گا ———

منظر سوم

(رات کا وقت ہے رنواس میں روشنی ہو رہی ہے - رانی سیتلا دیوی اور مہاراجہ انردھ سنگھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں)

انردھ سنگھ - رانی کچھ سُنا

سیتلا - نہیں، کیا ہوا

انردھ سنگھ - دیکھو یہ ایک پتر کسی کا آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ راجہ چمپت رائے بندیلہ راجپوت نہیں ہے

سیتلا - کیا یہ صحیح ہے

انردھ سنگھ - بالکل جھوٹ - میں خوب جانتا ہوں وہ راجہ پورن چند کے راجکمار ہیں - اور پورن چند راجہ اودا بیت کے پُتر تھے - جو راجہ پنچم اور وہ بیر بھدر کے خاندان سے تھے - بھلا میں نے جو بات طے کی تھی وہ جھوٹ ہو سکتی ہے

سیتلا - پھر جب تک اس کو ٹالتے رہیں گے - بیاہ ہو جائے تو اچھا ہے

انردھ سنگھ - ہاں ارادہ ہے کہ اگلے مہینہ میں فارغ ہو جاؤں کیونکہ خبر آئی ہے کہ محی الدین اورنگ زیب اس طرف سے گزریں گے اور عجب نہیں کہ ولیعہد بہادر کے خلاف جنگ مقصود ہو - اور پھر میں جنگ میں پھنس جاؤں اور یہ کام رہ جائے

سیتلا - سوامی کیا لڑائی آپ ہی کے لئے بنائی گئی ہے

انردھ سنگھ - ہاں رانی راجپوت کے گھر میں پیدا ہونے کا یہی سبھاؤ ہے

منظر چہارم

(دربار آراستہ ہے درمیان میں آگ جل رہی ہے پروہت ہون کر رہا ہے ——— ہون کے ختم پر بندیلہ راج کا قومی ترانہ گایا جاتا ہے - اور راجہ چمپت رائے کا بیاہ راجکماری سارندہ سے ہوتا ہے)

انردھ سنگھ - پروہت اب تم جو نہ کی پھیرو

پروہت - جو حکم

(پروہت بھوزی پھیرتا ہے)

درباری - راجہ چمپت رائے، مبارک

انردھ سنگھ - چمپت رائے - میں بھی تم کو مبارکباد دیتا ہوں لیکن اسی ملک میں چاروں طرف جنگ کا دیوتا اسنکھ پھونک رہا ہے کہیں تم اس شادی کے بعد عیش و عشرت میں نہ پڑ جانا، لو یہ بیش قیمت خنجر جو شہنشاہ اکبر نے میرے پُرکھوں کو عطا کیا تھا - وہ تم اپنی کمر سے باندھ لو لیکن اس خنجر کو لے کر قسم کھاؤ - کہ تم حق کے لئے جان دینے سے دریغ نہ کرو گے - یاد رکھو بندھیلکھنڈ کے پاس بہادر بیٹوں کی بہت کمی ہے - اس لئے اس مبارک خنجر کی عزت

حرمت اب تمہارے ہاتھ ہے

درباری - جے - مہاراج انردھ سنگھ کی جے - بندیلہ راج کا بول بالا ہو

راجہ چمپت رائے - (خنجر کو چوم کر) میں بزدل نہیں ہوں یقین رکھئے - چمپت رائے کے رگوں میں بندیلہ خون دوڑ رہا ہے - اگر میں بندیلہ وقار کو گرانے کی کوشش کروں گا تو سب سے پہلے یہ خنجر میرے قلب میں لہرائے گا ——

درباری - جے ہو - راجہ اور چھا کی جے ہو

پروہت - راجہ چمپت رائے اس مقدس اگنی کو دیکھو

چمپت رائے - دیکھ رہا ہوں

پروہت - خنجر کو چومو

چمپت رائے - خنجر کو میان سے باہر نکلتا ہے اور چومتا ہے

پروہت - تو میں راجپوتوں کی سبھا میں اقرار کرتا ہوں کہ جب تک بندیلہ راج کی گذشتہ شان و شوکت واپس نہیں آئے گی - اس وقت تک قلعہ اور چھا پر آزادی کا پرچم نہیں لہرائے گا - جب تک کمر در استریاں بندیلہ راجدھانی میں ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک بے کھٹکے نہ چلی جائیں گی —— تم چین سے نہ بیٹھو گے کیا یہ پرتگیا کرتے ہو

چمپت رائے - (تلوار سے قسم کھا کر) ایسا ہی ہوگا

انردھ سنگھ - اچھا اب آپ سارن کو لے کر اور چھا سدھاریئے سب انتظام مکمل ہے (بے تاب ہو کر رونے لگتا ہے)

درباری - مہاراج - آنسو بہانا آپ کے لئے مناسب نہیں ہے

(سنکھ پھونک رہا ہے - سارن اور چھا روانہ ہوتی ہے)

انردھ سنگھ - کیا مجکو اپنی سب سے پیاری بہن سے ہمیشہ کے لئے بچھڑنے کے بعد آنسو بہانے کا حق حاصل نہیں ہے؟

درباری - مہاراجا - اسی لئے تو کنیا کا دان بڑا ہوتا ہے صبر کیجئے ورنہ راجکماری سارن کو ڈولہ میں قرار نہ آئے گا

(انردھ سنگھ نڈھال ہو کر تخت پر گر پڑتا ہے)

منظر پنجم

(دربار عام میں چمپت رائے تقریر کرتا ہے)

چمپت رائے - درباریو - آج تم سے رخصت ہوتا ہوں اور اپنا تاج و تخت اپنی خوشی سے اپنے قوت بازو پہاڑ سنگھ کے سپرد کرتا ہوں - تم کو معلوم ہے کہ میں نے تخت نشین ہوتے ہی سلاطین مغلیہ کو خراج دینا بند کر دیا تھا - لیکن اب میں مصلحتاً اطاعت کرنا چاہتا ہوں - میں اپنی فوج کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے میرے اشاروں پر اپنے گھر بار کو چھوڑا - اور ہتیلی پر جان لے کر میرے احکام بجا لائے —— اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں —— پہاڑ سنگھ - اور چھا کی راجدھانی پر تم کو براجماں ہونا - مبارک

(درباری رونے لگتے ہیں - اور رانی سارندہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

عورتیں - مہارانی ہم کو چھوڑ کر کہاں چلیں

رانی - سوامی کی ایچھا سب سے مقدم ہے

پہاڑ سنگھ - اچھا اس شرط پر میں سنگھاسن پر بیٹھوں گا کہ جب آپ اور چھا واپس تشریف لائیں تو سنگھاسن آپ ہی کا ہے -

درباری - ہاں ضرور شاباش بہادر سنگھ - بندیلہ راجکماروں کا یہی طریقہ ہے

چمپت رائے - اچھا رخصت

(سارندہ اور چمپت رائے جاتے ہیں)

منظر ششم

(نظام الدین کا شکستہ قلعہ)

چمپت رائے - جگمل سنگھ - رانی سارن

چمپت رائے - جگمل سنگھ کیسے آئے

جگمل سنگھ - مہاراجا - اشیرباد دینے آیا ہوں

چمپت رائے - سب پرماتما کا احسان ہے

جگمل سنگھ - اعلیحضرت نے بہت خوشی کا اظہار کرکے آپ کو کالپی کی بیش قیمت جاگیر عنایت کی ہے - اس سے زیادہ احسان پرماتما کا کیا ہو سکتا ہے ؟

چمپت رائے - ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے ہیں - بادشاہ سلامت کا اب آخری وقت ہے - بھائیوں میں رقابت ہے - اور میرا خیال ہے کہ شہنشاہ دہلی دکن میں ہے

جگمل سنگھ - اس بساط کے مہرہ سب خطرناک ہیں

چمپت رائے - ہاں - لیکن اقبال محی الدین ہی کے سر ہے

جگمل سنگھ - تو ہم لوگ کیا کریں

چمپت رائے - ہم تو تلوار کے دھنی ہیں - جو تلوار کہے گی وہی ہوگا - لیکن ہوگا بڑا برا - خون کی ندیاں بہیں گی

جگمل سنگھ - رام نہ کرے ——— (جاتا ہے)

(رانی سارن محل سرا میں بیٹھی ہوئی ہے - اور چمپت رائے داخل ہوتا ہے)

چمپت رائے - تم نے سنا - کالپی کی ایک نولاکھ سالانہ کی جاگیر مجکو آج دربار میں عطا ہوئی ہے اب تو خوش ہو

سارن - یہ ان ناتھ آپ کی عزت بڑھی میں بھی خوش ہوئی - ایشور آپ کو اس سے زیادہ عزت دے

چمپت رائے - سارن تم اُداس سی کیوں ہو - کہو کیا ہوا - تم جب سے آئی ہو کچھ کھوئی ہوئی سی رہتی ہو - بولو کیا بات ہے

سارن - پران ناتھ - یہ خیال غلط ہے

(رونے لگتی ہے)

چمپت رائے - کوئی بات ضرور ہے تم روتی کیوں ہو ؟ سچ کہو کیا بات ہے

سارن - (روتے ہوئے) آپ یہ نہ پوچھئے - اس کو ایسا ہی رہنے دیجئے - ہاں یہ سچ ہے کہ آج کل میں کچھ اُداس سی رہتی ہوں

چمپت رائے - (چیں جبیں ہوکر) کیوں ؟ اور چھا میں کیا تھا جو یہاں دہلی میں نہیں ہے ؟

سارن - (ناگن کی طرح بل کھاکر) ہاں اور چھا میں رانی تھی دلی میں جاگیردار کی باندی ہوں ——— کوئی گھوڑے پر چڑھ کر گدھے پر نہیں بیٹھتا - سوامی آپ برا نہ مانیں آپ نے یہ آرام و چین بڑے مہنگے داموں خریدا ہے

چمپت رائے (ششدر ہوکر) میں تمہاری رعنائی عظمہ سے بے خبر تھا - آج آنکھیں کھل گئیں ایک پردہ تھا جو اٹھ گیا - (روتے لگتا ہے)

اچھا سارن چمپت رائے بندیلہ راجہ ہے اور راتوں رات دہلی کو چھوڑ دے گا - اب ———

سارن - سوامی - ٹھیرئیے کوئی پرتگیا نہ کیجئے - دربار شاہی

سے اجازت لے کر آپ اور چھا جانے کا ارادہ کریں۔

راجپوت پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگتا ہے

چمپت رائے۔ مناسب ہے۔ آج دربار میں تذکرہ کروں گا

منظر ہفتم

(راجہ چمپت رائے دربار سے اجازت لے کر اور چھا واپس آگیا ہے۔ اور سارا بندیل کھنڈ اس خوشی سے نہال ہوگیا ہے۔ رانی سارندہ بھی بہت خوش ہے۔ اسی عرصہ میں شاہجہاں بیمار پڑتا ہے۔ شہزادوں میں پہلے ہی سے رقیبانہ جنگ تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی دلوں کا غبار ظاہر ہوگیا۔ مُراد و محی الدین دکن سے چل کھڑے ہوئے۔ برسات کا موسم ہے دھول پور کے قریب چمبل ندی کے کنارہ خونریز جنگ نے محی الدین کو مجبور کیا ہے۔ کہ وہ چمپت رائے سے مدد طلب کرے)

راجہ چمپت رائے۔ خاں صاحب۔ میں مدد کرنے کو طیار تو ہوں لیکن ولیعہد کے خلاف ہوگا

سفیر۔ مہاراجہ اس وقت تو آپ کو شہزادہ محی الدین کی امداد کرنا پڑے گی۔ آپ کو معلوم ہے شہزادہ کو بڑی تشویش ہے عین دریائے چمبل کے کنارہ شاہی فوج پڑے جمائے کھڑی ہے اس حالت میں تو آپ کو مدد کرنا ہی چاہیئے

(چمپت رائے کچھ علیحدہ گفتگو کرتا ہے)

سفیر۔ مہاراجہ آپ پر بڑا بھروسہ ہے۔ آپ کی امداد انشا اللہ رائگاں نہ جائے گی۔ اور اس کے علاوہ الطاف خسروانہ سے بھی آپ محروم نہ رہیں گے

مہاراجہ۔ خانصاحب آپکا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن یہ مُعاملہ ملکی حیثیت سے بھی اہم ہے میں اس معاملہ میں زرا ذمہ دار عہدہ داروں اور فوجی افسروں سے بھی مشورہ کرلوں۔ اوس کے بعد آپ کو شام تک اطلاع دیدوں گا

(خانصاحب جاتے ہیں)

(پردہ بدلتا ہے)

(رانی سارن ایک کتاب دیکھ رہی ہے)

چمپت رائے۔ سارن، شہزادہ محی الدین کا پیام آیا ہے کہ داراشکوہ کے خلاف تلوار اُٹھاؤں تمھاری کیا رائے ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ اس ہار میں محی الدین ہی ایک سچا موتی ہے اور باقی سب جھوٹے ہیں۔ فتح دیکھنا محی الدین ہی کی ہاتھ رہے گی — خون بہت بہیگا

سارن۔ آپ کو محی الدین کی مدد کرنا چاہیئے

چمپت رائے۔ خوب سوچ لو۔ داراشکوہ سے عداوت مول لینا ہے

سارن۔ اچھا میں بھاگوت میں سری کرشن جی سے مشورہ مانگتی ہوں

(بھاگوت بند کرکے سری کشن جی کا دھیان کرکے بھاگوت کھولتی ہے)

دیکھئے۔ پہلے ادھیا کے اشلوک ۲۸۔ ۳۱۔ ۳۲ میں سری کشن جی فرماتے ہیں کہ" اے کرشن مجھے اپنے قریبی رشتہ داروں کو دیکھ کر جو جنگ کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں بھلائی نظر نہیں آتی کیونکہ اپنے رشتہ داروں کو مار کر نہ مجھے کامیابی اور نہ سلطنت اور نہ راحت کی خواہش ہے" اے ارجن مخنثوں کا طریقہ اختیار نہ کر تیرے لئے یہ زیبا نہیں اے دشمنوں پر فتح پانیوالے بُزدلی اور پست ہمتی کو چھوڑ کر کھڑا ہو۔" اے ارجن جو سوچنے کی بات نہیں اوس کو سوچتے ہو اور اہل علم کی باتیں کرتے ہو حالانکہ اہل علم کسی شخص کی موت یا زندگی کی فکر نہیں کرتے " اے ارجن اگر تو جنگ میں کام آئیگا

توسورگ میں جائے گا اور اگر فتح پائے گا تو تجھے روئے
زمین کی بادشاہت ملے گی - اس لئے اے کنتی کے لڑکے
جنگ کی ٹھان کر اٹھ
" تمھارا ادھکار افعال تک ہی محدود ہے نہ کہ اُن کے
ثمرات پر نتائج کی غرض سے افعال عمل میں نہ لا البتہ افعال
کے ترک سے بچ "

سوامی - اب کیا ہے - دیکھئے سری کشن جی نے صاف
صاف بتلا دیا کہ

راجہ چمپت رائے - ٹھیک ہے - لیکن معاملہ بڑا مشکل ہے

سارن - پران ناتھ - " مَیں واقف ہوں - منزل کٹھن
ہے - قدم قدم پر کانٹے ہیں - ہمیں اپنے سپاہیوں کا
خون پانی کی طرح بہانا پڑے گا - ہم اپنا خون پانی ایک
کریں گے اپنے سجیلے بہادروں کا سر کٹوائیں گے - اور
چنبل ندی کا گھاٹ بنائیں گے - لیکن سوامی یاد رکھنا
جب تک چنبل کا دھارا اجلال وعفت کے ساتھ اپنے
مُنھ کا بھین اُگلتا رہے گا تو ہمارے سرفروشوں کا خون
لعل بن بن کر روشن رہیگا - اور جب تک بندیلہ قوم
کا نام لیوا دنیا میں باقی رہے یہ خون اوس کے ماتھے پر
کیسر بن کر چمکے گا "

چمپت رائے - اچھا پیاری سارن ابھی شہزادہ محی الدین
کو جواب بھیجے دیتا ہوں

(جاتا ہے

(پردہ گرتا ہے)

منظر ہشتم

(برسات کا زمانہ ہے - آسمان پر بادل ہی بادل نظر آرہے ہیں قلعہ سے
سرفروش بندیلوں کی کال گھٹا اٹھتی ہے - اور چمبل ندی پر چھا جاتی
ہے ہر سپاہی " بیررس " سے جھوم رہا ہے - رانی سارن اپنے دونوں
راجکماروں کو گلے سے لگاتی ہے اور راجہ چمپت رائے کو پان کا بیڑہ دیتی
ہے ہتیار سجتی ہے اور دستار پر کلغی مرصع لگاتی ہے)

رانی سارن - راجکمارو، اب بندیلہ قوم کی لاج تمھارے
ہی ہاتھ ہے دیکھنا لڑائی سے منھ موڑ کر نہ آنا - بندیلہ
قوم کے وقار کو قائم رکھنا - کوئی بچہ بوڑھا یا عورت سامنے
آئے تو تلوار کو اوس بے گناہ خون سے آلودہ نہ کرنا - جاؤ
راجکمارو جاؤ ——— دیر ہوتی ہے - شہزادہ محی الدین
کو تم لوگوں کی ضرورت ہے ——— اور تمھارے پتا
زبان دے چکے ہیں - دیکھو کہیں اون کو شرمندگی نہ ہو

دونوں راجکمار - ماتاجی - جیسی آپ کی اگیان ہوگی ویسا
ہی ہوگا

(رانی سارن دونوں کو گلے لگاتی ہے)

(راجکمار جاتے ہیں)

راجہ چمپت رائے - سارن - راجکماروں کو رخصت کر دیا
تمھاری ہمت کی داد دینا چاہیئے

رانی سارن - ایشور کی سہایتہ چاہیئے ورنہ میں ایک کمزور
عورت کیا کر سکتی تھی وہی صبر دیتا ہے - میں نے کیا کیا
وہ امانت قوم ہی کی تھی - اوس کے دینے میں مجھکو کیا
عذر ہوتا

چمپت رائے - سارن (ہاتھ لے کر) پیاری سارن یہ ہر
شخص کا کام نہیں ہے - معاف کرنا میں بھی جانتا ہوں
——— زندہ بچے تو ملاقات ہوگی
لیجئے بیڑا لیجئے - لائیے ہتیار بھی سج دوں اور دستار

کلغی بھی لگا دی ہے - اچھا سوامی رخصت - ایشور تمہاری تلواروں کو اندر کا بجرا بنا دے - بندیلوں کی لاج تمہارے ہاتھ ہے

چمپت رائے - پان کھا کر - رخصت - آج تو خوشی سے تمہارا ایک ایک عضو - پھڑک رہا ہے - ایک راجپوتنی کا یہی وصف ہے

(جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

(رانی سارن فوج کے ایک حصہ کو طلب کرتی ہے)

سارن - کوشلیا - استری پلٹن کو لیس ہونے کا حکم دو - میں دو گھنٹہ بعد مردانہ بھیس میں پچھم جانب سے جمنل ندی کے دشمنوں پر حملہ کروں گی - سب تیار رہیں ——

کوشلیا - رانی - ایسا ہی ہوگا

(کوشلیا جاتی ہے)

منظر نہم

(میدان جنگ - راجہ چمپت رائے نے بندیلوں کو کمیں گاہ میں چھپنے کا حکم دے دیا - شہزادہ محی الدین و مراد کی منتشر فوج کو منظم کیا دارا شکوہ کو دھوکہ ہوا - بندیلہ اپنی کمیں گاہوں سے نکل پڑے اور دریا میں گھوڑے ڈال دیے - چمپت رائے دارا شکوہ کی فوج کو دھوکہ دیکر دریا کے اس پار جاتا ہے - محی الدین کی فوج کی ہمتیں بندھ گئیں دست بدست جنگ کی نوبت آئی کہ ایک جتھا سپاہیوں کا پچھم جانب سے نمودار ہوا - یہ سارندھا تھی)

راجہ چمپت رائے - چھترسال - تم مشرقی جانب اپنی فوج لیجاؤ - اور کمیں گاہوں میں چھپ جاؤ

(چھترسال چلا جاتا ہے)

چمپت رائے - اندرجیت - تم اتر جانب اپنی فوج لے جاؤ اور کمیں گاہ میں چھپ جاؤ

(اندرجیت چلا جاتا ہے)

(شہزادہ محی الدین و شہزادہ مراد خیر مقدم کرتے ہیں)

محی الدین - راجہ چمپت رائے - آپ کی اس مہربانی کا شکریہ تو ادا کرنا فضول ہے - کیونکہ شکریہ ادا کر کے آپ کے قومی وقار کو ٹھیس لگے گی - ہاں خدا کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہیئے

مراد - مہاراجہ اُرچھا کو ان کی خدمات کا خاطر خواہ صلہ ملیگا

محی الدین - یہ قبل از وقت گفتگو ہے - جو خدا کی مرضی ہو

چمپت رائے - شہزادہ صاحب یہ سچ ہے جو خدا کی مرضی ہے وہی سب سے بہتر ہے - میری رائے ناقص میں فوج کی تنظیم کرنا ضروری ہے

محی الدین - ہاں ضرور - آپ نے اس فوج کے کئے حصہ کئے ہیں

چمپت رائے - تین حصہ ایک حصہ میرے تحت میں ہے دو حصہ خادم زادوں کی تحت میں مشرق و شمال کی کمیں گاہوں میں ہیں - وہ دیکھئے شہزادہ دارہ شکوہ مورچہ ہٹا رہے ہیں - اون کو دھوکہ ہو گیا بس اب وقت ضایع نہیں ہونا چاہیئے گھوڑے دریا میں ڈال دینا چاہیئے

محی الدین (بسم اللہ کہکر) گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہے

(اللہ اکبر کی پُرہیبت تکبیر سے ارض بندیلہ گونج اٹھتی ہے)

چمپت رائے - اس سات گھنٹہ کی نقل و حرکت میں ۷۰۰ بندیلہ جانبازوں کی لاشیں پھڑک رہی ہیں - شکر ہے کہ میری بات خالی نہیں گئی

محی الدین - چمپت رائے دیکھنا وہ افق مغرب پر کیا غبار

دکھائی پڑ رہا ہے

چمپت رائے - دیکھئے ابھی معلوم ہوا جاتا ہے

(سپاہیوں کا ایک دل دارا شکوہ پر حملہ آور ہوا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فرشتہ رحمت آپکی امداد کے لئے آسمان سے اترا ہے)

(گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے)

چمپت رائے - فتح - مبارک

محی الدین - خدا کا شکر ہے کہ اوسنے حق و باطل کا فرق دکھا دیا

(ایک سردار آتا ہے)

چمپت رائے - کیا ہے ——

سردار - ہنس کر - بندیلہ قوم کا راج مبارک - اس جان نثار کو بھول گئے ——

چمپت رائے - میری سارن ——

سارن - (سر تعظیم خم ہوکر) سوامی

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ دوسرا

پردۂ اوّل

(شہزادہ محی الدین چنبل کے ساحل سے آگرہ کی طرف چلا" اقبال اس کے سر پر مور چھل ہلاتا تھا اور نصرت دکامرانی نقارہ بجاتی تھی - آگرہ پہنچتا ہے تو شوکت اوس کے لئے تخت شاہی کو سجاتی ہے - دربار ہوتا ہے سرداران شاہی کی خطائیں معاف ہوتی ہیں مناصب بحال کئے جاتے ہیں - راجہ چمپت رائے کو اوس کی سرفروشانہ خدمات جلیلہ کے صلہ میں دوازدہ ہزاری کا منصب عطا ہوتا ہے اور اورچھا سے بنارس تک کی جاگیر عطا ہوتی ہے اور بندیل راجہ پھر دہلی میں قیام کرتا ہے - اور رانی سارندھا پھر خاموش اوجھل ہے)

چمپت رائے - جگمل سنگھ - کنور چھتر سال - سارن

(چمپت رائے دربار سے خلعت پاکر آتا ہے)

کنور چھتر سال - پتاجی مبارک

سارن - کیسی مُبارکباد

چھتر سال - شہنشاہ اورنگ زیب نے آج دربار عام میں پتاجی کو بندیلہ راج کی جانبازانہ خدمات و "سرفروشیوں" کے صلہ میں اورچھا سے بنارس تک کی جاگیر اور دوازدہ ہزاری منصب مع خلعت ہفت پارچہ عطا کیا ہے

سارن - ہاں - سوامی

چمپت رائے - سارن - دیکھو یہ تلوار خاص شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے اسلحہ خانہ کی عطا کی ہے - اس تلوار کو شہنشاہ جہانگیر نے لاہور کے معرکہ میں استعمال کیا تھا - اصفہانی تلوار ہے

سارن - سوامی آپ کو مبارک ہو - دشمنوں کے حسد سے پرماتما آپ کو محفوظ رکھے

چمپت رائے - سارن تمھاری خوشی میری تمام کلفتوں کیلئے کافی ہے

سارن - سوامی ——

(جگمل سنگھ آتا ہے اور کنور چھتر سال اور رانی سارن جاتے ہیں)

چمپت رائے - کہو جگمل کیا سماچار ہیں!

جگمل - اشیرباد دینے آیا ہوں - بہت سے راجپوت آپ کی اس عزت کو دیکھ کر بھسم ہو گئے

چمپت رائے - کون

جگمل - نام لینے سے کیا فائدہ - کوئی گھوڑا آپ کے اصطبل میں

ولی بہادر خاں کا ہے ؟

چمپت رائے۔ ہاں۔ کیوں

جگمل سنگھ۔ ولی بہادر خاں کو اوس کی بڑی فکر ہے کسی مناسب موقع سے اوس کو واپس کر دیجئے گا

چمپت رائے۔ لیکن وہ تو میدان جنگ میں گرفتار ہوا ہے۔ ولی بہادر خاں زخمی پڑا ہوا تھا۔ اور یہ گھوڑا اپنی دُم سے مکھیاں اُڑا رہا تھا مجکو پسند آیا میں نے منع کیا کہ کوئی شخص اس کو جان سے نہ مارے زندہ گرفتار کرے۔ لیکن رانی اُرچھا نے اوس کو زندہ گرفتار کیا ہے ——

جگمل۔ ہاں ولی بہادر خاں کو وہ بہت عزیز ہے اور شائد وہ اوس کی طلبی کی درخواست دینے والے ہیں ——

چمپت رائے۔ اچھا دیکھا جائے گا۔ (متفکر ہوکر)

(جگمل جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر دوم

(دلی میں رہتے سال بھر ہوا تھا۔ کہ ایک دن کنور چھتر سال گھوڑے پر سوار ہوکر سیر کو گیا۔ اور ولی بہادر خاں کے محل کی طرف سے جا نکلا۔ راجکمار تنہا تھا ولی بہادر خاں کے آدمی وقت کے منتظر تھے گھوڑا چھین لیا۔)

(کنور چھتر سال مغموم داخل ہوتا ہے)

سارن۔ کیوں خیریت ہے

کنور چھتر سال۔ گھوڑا ولی بہادر خاں کے آدمیوں نے چھین لیا!

سارن۔ (غصہ سے چہرہ تمتما اٹھا) کچھ فکر کی بات نہیں گھوڑا گیا بلا سے گیا۔ لیکن دُکھ یہ ہے کہ تو اوسے زندہ کھو کر کیسے لوٹا۔ ؟ کیا تیری رگوں میں بندیلہ خون نہیں ہے ؟ تجکو ثابت کر دینا چاہیئے تھا کہ بندیل راجکمار سے گھوڑا چھین لینا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے ——"

(غصہ سے) جاؤ کوشلیا استری پلٹن کو لیس ہونے کا حکم دو۔

(کوشلیا جاتی ہے)

چھتر سال تم اور تمہارے پتا دونوں اب شاہی غلام ہوگئے ہیں۔ تم لوگ اب داد عیش دو۔ اور میں ابھی اپنی استری پلٹن کی مدد سے گھوڑا لاتی ہوں — چاہے انجام کچھ ہی ہو

(جاتی ہے)

(سپاہیانہ باناسجا کر اور استری پلٹن کو لے کر خانصاحب کے اصطبل سے زبردستی گھوڑا کھولتی ہے۔ جنگ کی نوبت آتی ہے مگر بندیلہ خواتین کے سامنے کسی کی پیش نہیں جاتی ہے)

چھتر سال۔ راج ماتا۔ آپ آگئیں (قدم چومتا ہے)

سارن۔ لو۔ یہ تمہارا گھوڑا ہے

(گھوڑا سارن کی گود میں اپنا سر ڈال دیتا ہے۔ اوس کے آنکھوں سے آنسو کی دھار بہنے لگی)

اے بے زبان گھوڑے تو کیوں رو رہا ہے۔ لا تیرے آنسو پونچھ دوں

(گھوڑا سر جھکا دیتا ہے)

(چمپت رائے داخل ہوتا ہے)

چھتر سال۔ پتاجی۔ دیکھئے راج ماتا نے کمال کر دیا

چمپت رائے۔ کمال کر دیا ——

سارن۔ سوامی آپ متفکر کیوں ہیں

چمپت رائے۔ کاش یہ گھوڑا مجکو نہ دکھائی دیتا۔ یہ گھوڑا میرے اعزاز کے لئے آہوئے زر نگار ثابت ہوا۔ سینا جی نے

ہرن دیکھا۔ ہرن ہوئیں۔ میں نے گھوڑا دیکھا۔ اعزاز ہرن ہوا

چھترسال۔ (منجھر ہوکر) کیا قصہ ہے

چنپت رائے۔ رانی سارن گھوڑا کھول لائیں۔ اور ادھر عالمگیر کو پرچہ لگا اور ان کو رانی کی یہ جرأت ایک منصب دار کے خلاف ناگوار ہوئی اور گھوڑے کی واپسی کا حکم آیا ہے اور اوسی کے ساتھ منصب وجاگیر بھی اس گھوڑے کی نذر ہوگیا۔ ولی بہادر خاں پہلے ہی سے مجھ سے جلتے تھے۔ اور بہت سے راجپوت بھی اس سازش میں شریک ہیں

چھترسال۔ گھوڑا واپس کردیا جائے

رانی سارن۔ نہیں میری لاش جب اٹھیگی اوس وقت یہ گھوڑا جاسکے گا

چنپت رائے۔ رانی تمھاری ضد سے یہ ہوا ـــــ گھوڑا تو جائے گا

رانی سارن۔ سوامی۔ جب آپ ہی یوں کہتے ہیں تو بیشک چلا جائے گا (رونے لگتی ہے)

منظر سوم

(راجہ چنپت رائے قلعہ میں مقیم ہیں۔ منصب وجاگیر جانے کا قلق ہے لیکن رانی سارندہ کی وجہ سے شکایت نہیں کرتے۔ عالمگیر نے اطمینان ہونے کے بعد چنپت رائے کی جانب توجہ کی راجہ سبھ کرن بندیلہ نے راجہ چنپت رائے کو خاک میں ملانے کی قسم کھائی۔ بندیلہ سردار راجہ چنپت رائے سے منحرف ہوکر شاہی فوج میں شامل ہوگئے۔ قرب وجوار کے بندیلہ راجاؤں نے بھی رفاقت سے منھ موڑا۔ چنپت رائے نے بھی آوارہ گردی شروع کی۔ رانی سارندہ اور راجکمار چھترسال برابر راجہ کے ساتھ سائے کی طرح تھے۔ شاہی فوج نے مقابلہ سے عاجز آکر عالمگیر کو اطلاع کی کہ راجہ کو گرفتار کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ محاصرہ اٹھالیا گیا۔ راجہ چھپر چھ قلعہ میں واپس آیا لیکن چند ہی ماہ کے بعد آوارہ دشت ہونا پڑا۔ اس وقت میں ہفتوں سے شاہی فوج اور چھا کا محاصرہ کئے ہوئے ہے اور راجہ چنپت رائے بخار میں مبتلا ہیں)

چنپت رائے۔ (آنکھ کھول کر) سارن کیا سماچار ہے؟

سارن۔ فصیلوں کو گولوں نے چھلنی کردیا ہے۔ بیس ہزار جانیں قلعہ میں بند ہیں۔ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ مردوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ رسد بند ہے۔ باہر سے آمد ورفت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ استریاں اپنے بالکوں اور سوامیوں کو زندہ رکھنے کے لئے فاقہ کررہی ہیں۔ استریاں سورج دیوتا کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوس رہی ہیں۔ سب سے بڑھ کر آپ کی بیماری نے قلعہ میں کہرام مچادیا ہے

راجہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارن آج دشمن ضرور قلعہ کے اندر گھس آئیں گے

سارن۔ ایشور نہ کرے کہ یہ دن دیکھنا پڑے

راجہ۔ ان قلعہ والوں کا کیا حال ہوگا؟

سارن۔ ہم لوگ قلعہ چھوڑ کر چلے جائیں تو کیا ہو؟

راجہ۔ کیا ان بدنصیبوں کو اپنی زندگی پر نفرت کرنے کے لئے

سارن۔ نہیں شاید دشمن ان پر رحم کریں۔ دشمنی تو ہم سے ہے نہ کہ ان سے

راجہ۔ نہیں یہ تو مشکل ہے۔ ہم سے نہیں ہوسکتا ہے کہ اپنی بلا ان غریبوں کے لئے چھوڑ جائیں ـــــ عورتوں و بالکوں کو میں کسی طرح بھی چھوڑ نہیں سکتا

سارن۔ مگر یہاں رہنے سے ہم کیا کرسکتے ہیں

راجہ۔ مرتو سکتے ہیں؟ قید کی مصیبتیں سہوں گا لیکن قلعہ میں رہوں گا

سارن۔ پران ناتھ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں مجھکو شرمندگی ہوئی کہ ایسی بات کیوں کی۔ (کچھ سوچ کر) اچھا اگر آپ کو یقین ہو جائے کہ ان کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہوگا تو آپ چل سکتے ہیں؟

راجہ۔ (بہت غور کرنے کے بعد) یقین کیسے ہو؟

سارن۔ شاہی سپہ سالار کی تحریر!

راجہ۔ ہاں۔ اس شرط سے کہ یہ لوگ بھی ہم کو رخصت کر دیں

(سارن جاتی ہے)

منظر چہارم

سارن۔ کنور میں نے تم کو اس لئے بلایا ہے کہ تم کو میں بندیلہ راج کی آن پہ بھینٹ چڑھا دوں

چھتر سال۔ ماتا جی جو آگیان ہو میں تیار ہوں

رانی سارن۔ آج لڑائی کی کیا کیفیت ہے

چھتر سال۔ اب تک پچاس آدمی مر چکے ہیں

رانی سارن۔ بندیلہ کی لاج اب ایشور کے ہاتھ ہے۔ اچھا یہ کام کس کے سپرد کیا جائے

چھتر سال۔ میرے

رانی۔ پورا کروگے

چھتر سال۔ ہاں یقین تو ہے۔ اچھا ماتا جی رخصت

رانی۔ (سینے سے لگا کر) ایشور تمھاری صورت جلد دکھائے

(روتی ہے)

(چھتر سال جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

رانی سارندہ۔ جیون ناتھ۔ آپ نے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کیجئے

راجہ۔ تم نے وعدہ پورا کیا؟

رانی سارن۔ تحریری معاہدہ حاضر ہے جو آج تیر میں باندھ کر کنور چھتر سال نے بھیجا ہے

راجہ۔ ہاں اب میں چلوں گا۔ اور ایشور نے چاہا تو ایک بار پھر ان دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا مگر سارن سچ بتانا اس کاغذ کا کیا مول ہے؟

سارن۔ (آبدیدہ ہو کر) ایک جوان بیٹا۔ کاغذ کے ایک پرزہ کی اس قدر گراں قیمت کس نے ادا کی ہوگی

راجہ۔ (سکتہ ہو گیا) چیخ کر کون

سارن۔ کنور چھتر سال

راجہ۔۔۔۔۔ ہائے ۔۔۔۔۔ (بیہوش ہو کر گر پڑتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر پنجم

(راجہ چینت رائے۔ صاحب فراش ہے۔ تاریک رات میں پالکی میں بیٹھ کر قلعہ والوں کو اپنی قسمت پر رونے کے لئے قلعہ کی زمین دوز راستہ سے اور چھ سے ۵ میل آگے نکل چکا تھا۔ رانی سارندھا سپاہیانہ لباس پہنے۔ گھوڑے پر سوار تھی۔ راجہ پالکی میں بے سدھ تھا۔ اور کہار پسینہ میں شرابور تشنگی سے قافلہ کا برا حال تھا۔ پانچ سوار پالکی کے ساتھ تھے۔ کہ دفعتاً شاہی فوج آگئی اور پالکی سارندہ کے حکم سے روک لی گئی)

سارندھا۔ سوارو۔ دیکھو وہ فوج کیسی آرہی ہے

سوار۔ شائد شاہی فوج ہے!

رانی۔ شائد میرے راجکمار۔ میری سہایتہ کے لئے آئے ہوں گے

راجہ۔ (ہوش میں آکر) کیا ہے۔؟

رانی۔ (غور سے دیکھ کر) فوج آگئی ہے۔ کہار و پالکی روک لو

(پالکی رکتی ہے)

راجہ۔ بہادرو بیرو۔ آخری جوش اور دکھا دو

(تلواریں چمک جاتی ہیں)

سپاہی۔ جے ہے جے

راجہ۔ (پالکی سے باہر آکر) ——— سارن ———

(غش کھا کر گر پڑا)

سارن۔ (آمدیدہ ہوکر) پران ناتھ ———

چنپت رائے۔ سارن، افسوس جس ذلت سے تمام عمر بچتا رہا وہ آج مرتے دم نصیب ہوئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دشمن تمہارے پوتر شریر کو چھوئیں گے اور میں ہل بھی نہ سکوں گا ——— ہائے موت کب آئے گی؟

. . . . . سارن! تم نے بہت نازک موقعوں پر میری آن رکھی ہے۔"

سارن۔ (خوش ہوکر) پران ناتھ۔ ایشور نے چاہا تو جب تک سانس باقی ہے جیونا تھ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی

(تیغہ کو لے کر اپنے سینہ کے قریب رکھتی ہے)

راجہ۔ کیا تم کو منظور ہے!

سارن۔ مرتے دم تک مانوں گی

راجہ۔ آخری خواہش ہے اس کو رد نہ کرنا

سارن۔ (تیغہ کو سینہ میں چبھوئے ہو) یہ آپ کی درخواست ہے؟

چنپت رائے۔ نہیں یہ خواہش نہیں ہے

سارن۔ میری آرزو ہے کہ مروں تو سر آپ کے قدموں پر ہو

چنپت رائے۔ تم نے میرا مطلب غلط سمجھا۔ میں ایک پران مانگتا ہوں

سارن۔ شوق سے کہئے!

راجہ جنپت رائے۔ زبان کا پاس کرنا

سارن۔ (کانپ کر) فرمائیے

راجہ۔ اپنا خنجر میرے سینہ میں چبھو دو

سارن۔ (سناٹے میں) جیون ناتھ ایسا کبھی ہوا ہے؟

راجہ۔ میں قید ہونے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا

سارن۔ مجھ سے کیسے ہوگا

(پانچواں سوار بھی حق نمک ادا کرتا ہے)

راجہ۔ (جھنجھلا کر) کیا اسی پر آن نباہنے کا دعویٰ تھا

شاہی سپاہی۔ راجہ کو لینا ——— راجہ کو ———

رانی ——— ٹھیرو ———

(خنجر آبدار راجہ کے سینہ میں پیوست کر دیتی ہے)

شاہی سپاہی۔ رانی صاحبہ۔ ارے آپ کیا کر رہی ہیں۔ ہم آپ لوگوں کا بال بیکا نہ کریں گے یہ شہنشاہ عالمگیر کا حکم ہے۔ آپ لوگوں کو عزت و آبرو کے ساتھ چندیری پہونچا دیں آپ نے غضب کر دیا۔ کسی عورت کی تلوار نے بھی کبھی ایسا کام ہوا ہے؟ ہم نے اودے پور اور مارواڑ کے راجپوتنیوں میں بھی یہ خودداری کا جذبہ نہیں دیکھا۔ عورت کے لئے جان دیدینا بہت آسان ہے مگر رانی صاحبہ جو کام آپ نے کیا ہے وہ کوئی عورت کر ہی نہیں سکتی۔ بتلائیے ہم شہنشاہ عالمگیر کو کیا منہ دکھلائیں گے۔ آپ کے بندہ بے دام ہیں آپ کا جو حکم ہو اوسے بسر و چشم بجا لائیں اسلام سچا مذہب ہے اور [illegible] نام لیوا ہیں۔ ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ کوئی بیرونی فاتح

پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لئے حرام ہے جو حکم آپ دیں اوس کے بجالانے کے لئے ہم تیار ہیں۔

سارن ۔ (مسکراتے ہوئے) یہ خنجر۔ فرض کی کٹار ہے۔ پریم کی برچھی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پریم کی ناؤ پریم کے ساگر میں غوطہ لگا رہی ہے۔ جو سینہ کل تک عزت کا پاسبان اور میری محبت کا خزانہ تھا۔ آج اسی پاک سینہ کو میری تلوار چوم رہی ہے ——— اگر ہمارے راجکمار دن میں سے کوئی زندہ ہو تو ہماری دونوں لاشیں اون کو سونپ دینا ——— (خون آلود خنجر اپنے سینہ میں بھونک لیتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

مشیر احمد علوی ناظر (کاکوروی بی۔اے)

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

سنہ ۲۲ء		سنہ ۲۶ء		سنہ ۳۰ء		سنہ ۳۲ء					
ستمبر	۴ر	جنوری	۴ر	مئی	۴ر	مئی	۴ر				
اکتوبر	۴ر	اپریل	۸ر	اگست	۸ر	جون	۴ر				
سنہ ۲۳ء		مئی	۴ر	ستمبر	۴ر	جولائی	۴ر				
مئی	۶ر	جون	۴ر	اکتوبر	۴ر	اگست	۴ر				
جون	۸ر	اکتوبر	۴ر	نومبر	۴ر	ستمبر	۴ر				
سنہ ۲۴ء		نومبر	۴ر	دسمبر	۶ر	اکتوبر	۴ر				
جنوری	۴ر	دسمبر	۸ر	سنہ ۳۱ء		نومبر	۴ر				
فروری	۴ر	سنہ ۲۷ء		جولائی	۳ر	دسمبر	۴ر				
مارچ	۴ر	مارچ	۴ر	اگست	۳ر	سنہ ۳۳ء					
اپریل	۴ر	اپریل	۴ر	ستمبر	۴ر	فروری	۴ر				
مئی	۴ر	مئی	۴ر	اکتوبر	۳ر	مارچ	۱۰ر				
جون	۴ر	جون	۴ر	نومبر	۳ر	اپریل	۸				
جولائی	۶ر	سنہ ۲۸ء		دسمبر	۳ر						
اگست	۴ر	دسمبر	۸ر	سنہ ۳۲ء		جولائی	۴				
ستمبر	۶ر	سنہ ۲۹ء		جنوری	۱۲ر						
اکتوبر	۸ر	مارچ	۸ر	فروری	۴ر	ستمبر	۴				
		اکتوبر	۸ر	مارچ	۴ر	اکتوبر	۴ر				
		نومبر	۸ر	اپریل	۸ر	نومبر	۴ر				
						دسمبر	۴				

منیجر نگار لکھنؤ

فی سال:

ب کے ایک گوشہ سے دوسرے تک تیر کی ۔۔۔ ور زبان زد

کھ سکتا تھا،

وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے

وحی، اصطلاح میں اُس مراسلت یا پیغام کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے اپنے نبی پر بہ وساطت فرشتہ یا بلاواسطہ نازل ہو، وحی کا عقیدہ خالص اسلامی عقیدہ نہیں ہے کیونکہ بنی اسرائیل بھی کہا کرتے تھے کہ خدا ان کے قائدین سے براہِ راست کلام کرتا ہے۔ ارسطو ئیں تو خیر عیسیٰ ابن مریم کو الوہیت ثلاثہ کا رکن سمجھتے تھے لیکن اسلام کا وحی کو بوساطت فرشتہ یا بلا قرون مابعد کا معقولات کی جانب ایک قدم اٹھانا تھا کیونکہ بلاواسطہ وحی کا عقیدہ خدا کی تجسیم کو مستلزم تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا کا بندوں کے نام پیغام بھیجنا، اور پیغام کی نوعیت جس سے اس کے اعلیٰ ماخذ کا پتہ چلے کہاں تک محسوسی شہادت سے مسلم سمجھی جاسکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ہم اُن تمام رجحانات کو بھی بنظر امعان دیکھیں گے جن کی بنا پر انسانی تکمیلات کو ایک خاص کامل و مکمل ہستی کی جانب منسوب کیا گیا

خدا کا پیغام

تدریجی ترقی کی شہادت نے اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہونچا دیا ہے کہ فطرۃ کے حقائق انسان پر رفتہ رفتہ اور اکثر نہایت غیر متوقع طور پر رونما لیکن بہی انکشافات ہیں جنھوں نے انسان کے ارتقاء میں عظیم الشان حصہ لیا اور تہذیب و تمدن کو نوبت بہ نوبت موجودہ منزل تک پہونچایا۔ انسان کی قوت و کمزوری یا اس کی دیگر خصوصیات سب نتیجہ ہیں اُن بے شمار عملی رجحانات کے جو جو اُن کے افراد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ قصداً خواہ غیر ارادی طور پر۔ ماضی کی لاتعداد صدیوں میں نوع آدم کا رفتہ رفتہ سطح کے اوپر آنا نہایت دلچسپ مطالعہ ہے۔ خدا کی ارضی مخلوقات میں سے کتنی انواع اب تک معدوم ہو چکی ہیں جن کے آثار جا بجا زمین کی تہوں میں سے برآمد ہو رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کے معدوم کرنے میں خدا کسی انتقامی جذبہ سے متاثر نہ تھا۔ کیونکہ فطرت مقررہ اصول کی کاربند ہے اور انھیں اصول کے ماتحت فنا و بقا کا نظام جاری ہے جس کو ہم انسانی اصطلاح میں جو چاہیں کہکر پکاریں۔ اسی اصول کی بنا پر کتنے خاندان اور فرقے مٹ گئے۔ لیکن خدا نے نہ کسی کے بچانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا اور نہ بڑھاتا ہے۔ اقوام اس وسیع قانون کے ماتحت جسے "قانون حفظ حیات" (Law of preservation of life) کہتے ہیں اپنی فطرۃ اور ماحول کے مطابق متاثر ہوتی تھی اور اسی تاثر کا نام عروج و زوال ہے۔ انسان نے مجموعی طور پر جو باتیں اپنی آسانی کے لئے سمجھیں یا وضع کیں وہ بالکل انہی قدرتی اصول کے ماتحت تھیں اور نسلاً بعد نسلٍ کام آتی رہیں۔ مثلاً آگ یا دور پہیے کی ایجاد جس نے فاصلہ کی تسخیر میں بڑی حصہ لیا۔ جانوروں کے اہلی بنانے کی ابتدا۔ فن تعمیر میں محراب کی ایجاد۔ اوزاروں کی صنعت۔ پانی پر تیرنے اور کوئی بیرونی فاتح

چوم رہی ہے۔ علوم وفنون کہ یہ سب رفتہ رفتہ انسانی
برقی اکتشافات وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں اور ہے
ذہن سے ظہور میں آئے۔ اور ان میں سے کسی ایک تفصیل کو بھی خدا نے کہیں کوئی زندہ بتلایا۔ الغرض انسان کے دوران
ارتقا میں عمرانی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حقایق دریافت ہوئے ہیں اور اب نسل فی الجملہ اُن سے مستفید ہو رہی ہے
وہ ایک زمانہ یا کسی ایک شخص کی تکمیلات میں سے نہیں ہیں بلکہ پچھلے علم اور تجربہ کی بنا پر نسل کے افراد ان کو دریافت کرتے
رہتے ہیں اور یہ دستور العمل اب بھی جاری ہے اور آیندہ جاری رہے گا۔ اس کا نام ہدایت یا غیبی اعانت ہے جو کسی وقت
یا مقام کے لیے مخصوص نہیں

اب اس تمہید کے بعد دیکھنا چاہیئے کہ خدا کے پیغام کی نوعیت کیا ہے۔ خطاب کی شکلیں تین ہو سکتی ہیں۔ ایک تحریر۔ دوسرے
کلام فی الصوت۔ تیسرے ذہنی تصور۔ صاف ظاہر ہے کہ پہلی شکل خارج از بحث ہے کیونکہ خدا کی طرف سے تحریری احکام
پانے کا کسی نے دعویٰ نہیں کیا۔ دوسری صورت یعنی غیب کی آواز یا ندا۔ سو یہ صورت مشرقی ادب اور روایات میں اس قدر
عام طور پر مسلمہ ہے کہ ہمارے ذہن نہایت آسانی سے اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور ہم ہر زمانہ میں خاص خاص بندگان خدا کی
نسبت اس کو ممکن سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ آواز اگر مستدرک (Coherent) ہوگی تو وہ یا تو کسی
انسانی گلے سے خارج ہوگی یا صدائے بازگشت ہوگی یا جدید آلات سمعی مثلاً ریکارڈ۔ ریڈیو فون وغیرہ سے ماخوذ ہوگی۔ لیکن
خدا چونکہ جسم وغیرہ کی احتیاج سے بری ہے اس لئے اس کا مستدرک صوت پیدا کرنا محال ہے۔ اب رہی تیسری شکل
ذہنی تصور کی۔ جس سے وحی کا مفہوم مستنبط ہو سکتا ہے۔ سو اس کی حالت یہ ہے۔ کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصور
بغیر کسی خارجی سبب کے پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور وہ خارجی اسباب اسی کے تجربات یا مشاہدات ہوتے ہیں جو ذہن
انسانی میں مختلف و متنوع صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً خواب میں انسان کو عجیب و غریب شکلیں دکھائی دیتی ہیں
لیکن ان کی اجزای ترکیب فرداً فرداً اوس کے ذہن میں پیشتر سے موجود ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص نے سونے کا پہاڑ دیکھا تو اگرچہ
بیداری میں یہ تصور اس کے خیال میں نہ آیا ہو لیکن سونا اُس نے دیکھا ہے اور پہاڑ بھی اور ایک شے کی بہتات کا تصور
بھی ذہن میں آچکا ہے۔ سوتے وقت دماغ ارادے کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے لہٰذا ایک نقش دوسرے کسی نقش سے مل کر
یا باہم کئی نقوش آمیز ہو کر عجیب و غریب شکلیں (Synthetic Combination)
بنائے رہنا بالکل ایک فطری عمل ہے۔ بہرحال خواب ہو یا بیداری اگر تصور کو مطلق العنان کر دیا جائے تو گزشتہ تاثرات
کے ذخائر اسقدر کثیر التعداد نئی شکلیں پیش کریں گے کہ علم ریاضی ان کے حساب سے قاصر رہے گا

اب ہم ضمناً اس بحث کو اٹھائیں گے کہ خدا کے پیغام کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے، مخلوق پر اس کے اجرا کی کون سی
ممکن ہے۔ خود اجرا کی کیا ضرورت ہے اور یہ عقیدہ کہاں سے آیا لیکن اس پر بحث کرنے سے قبل انسان کے ذہنی ر
فی سما، تاریخ مجملاً جان لینا.... ضروری ہے ——— انسان نے جن قوانین کے ماتحت رفتہ رفتہ

تھے۔ اُن کے بے لکھے الفاظ صحرائے عرب کے ایک گوشہ سے دوسرے تک تیر کی سُرعت کے ساتھ پہونچ جاتے اور زبان زد ہوجاتے تھے۔ بچہ بچہ اُن کی خوبیوں کو پرکھ سکتا تھا اور ذرا سی اونچ نیچ کو سنتے ہی تمیز کرلیتا تھا۔ اَلشِّعْرُ دِیْوَانُ العرب بہت مشہور مقولہ ہے۔ عرب کی ریگستانی زندگی کے تمام مظاہرے اس میں محفوظ ہیں۔ عرب جو کچھ سوچتا تھا اور سمجھتا تھا اور محسوس کرتا تھا وہ ان قبائلی منادیوں یا اعلان کرنے والوں سے نہ بچ سکتا تھا۔ اُن کی چھوٹی اور بڑی رسمیں اُن کے قومی اور انفرادی رجحانات اُن کی آرزوئیں اور مقاصد شاعروں ہی کی آواز سے برروئے کار آتے تھے۔ غرضکہ باوجود خانہ جنگی اور انتہائی بدنظمی کے ایک متحد کرنے والا عنصر اندر ہی اندر کام کر رہا تھا۔ کوئی اخلاقی و تمدنی مربوط قوت اُن کے درمیان نہ تھی مگر یہی اشعار تھے جو مختلف شاعروں کی زبان سے نکل کر ایک غیر مدوّن سرمایہ بن گئے تھے۔ جس نے 'مروت' کے اخلاقی معاشرتی معیار قائم کئے تھے اور جس نے عصبیت اور نسبی شرف کو ایک طرح پر منظم پیمانہ پر قائم کردیا تھا۔ لوگ ایک مشترک جذباتی و احساسی یگانگت محسوس کرتے تھے۔ اشیا کا اندازہ انہی شاعرانہ معیاروں کی بنا پر کرتے تھے۔ اور زبان کے جوہر فصاحت۔ بلاغت اور دیگر محاسن کلام کو بن پڑھے ہوئے سمجھ لیتے تھے۔ اور کوئی بات اُن پر اثر نہ کرسکتی تھی مگر وہ جو فصیح و بلیغ شعروں کی شکل میں اُن تک پہونچتی تھی

لیکن ظاہر ہے کہ جاہلیت کے عربوں کا علمی مبلغ کیا ہوگا۔ یونان کے ماوراء الطبیعات کا علم انھیں مطلق نہ ہوا تھا۔ وہ بودھ کے نروانی فلسفہ سے قطعاً ناآشنا تھے۔ نہ زرتشت کی تعلیم کا وہاں کچھ اثر تھا نہ قدیم مصری تمدن کا انھیں پتہ۔ بنی اسرائیل کی نیم تاریخی روایات اور تورات و انجیل کے زیادہ مشہور نظریات، نجرانی عیسائیوں اور منتشر یہودی قبائل کے ذریعہ سے البتہ ان کے حیطۂ علم میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ الٰہیات۔ مذہب اور قوانین قدرت کے متعلق اُن کے احتمالات نہایت مبہم اور غیر مبسوط تھے۔ کاہن اور موحد ضرور جا بجا تھے جو اُس وقت کے حالات سے غیر مطمئن تھے۔ عیسائی اور یہودی زندگی کی بے راہ روی کو انھوں نے دیکھا تھا اور قائم شدہ خیالات اور سوشل نظام کی کمزوریوں کو جگہ جگہ سے محسوس کرتے تھے لیکن کسی تعمیری نظام کے قائم کرنے کی نہ اُن میں جرأت تھی نہ خیالی وسعت۔ عام عرب ناچار بت پرستی پر اُتر آیا تھا کیونکہ عصبیت کے قومی رجحان کی بنا پر اپنے جدامجد اسمٰعیل و ابراہیم کے طریقوں پر بزعم خود عمل کرنا اور اُن کے خداؤں پر تکیہ کرنا ایک فطری تقاضہ تھا۔ پرستش کا کوئی خاص طریقہ سوائے عجز اور نیازمندی کے اظہار کے اُن کو نہ آتا تھا۔ اللہ۔ رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ ملک۔ عقوبت۔ شیطان۔ قربانی۔ جبریل میکائیل اور بہت سی قرآنی اصطلاحات بول چال میں استعمال کرتے تھے

معاشی وسائل عرب کے کبھی قابل اطمینان نہیں رہے صرف تھوڑے زمانہ تک (شاید قبل مسیح دو ایک صدی تک) جبکہ ہندوستانی سواحل کی تجارت شام سے براہ یمن ہوتی تھی۔ مغربی عرب میں تجارتی گرم بازاری رہی ورنہ عرب پیشتر چراگاہی کا پیشہ کرتے رہے یا رہزنی اور غارتگری کا۔ مکہ میں کعبہ کی تولیت وہاں کے قبائل کی وجہ معاش تھی۔ مابعد اسلامی عہد میں بھی حجاز و نجد زائرین اور معتقدین ہی کے دست نوال پر منحصر رہے۔ عرب کی یہ بے مایگی اُس کی آزادی اور عزلت گزینی کا باعث ہوئی اور ساتھ ہی اُس کے باشندوں کی شجاعت۔ تہور، محنت کوشی اور خودمختاری کی فطری وجہ بنی۔ کوئی بیرونی فاتح

اُن کے مُلک کی طرف توجہ کر کے کیا لیتا اور خود انھیں جنگ سے باز رہنے کے لئے کس چیز کا خوف تھا۔ چنانچہ نہ تو عرب نسل میں بیرونی آمیزش ہوئی نہ بیرونی خیالات وہاں مسلط ہونے پائے۔ ہندوستان اور وسط یورپ برخلاف اس کے ہمیشہ بھوکی جنگجو قوموں کے آماج گاہ رہے۔ باہر کا خون۔ باہر کے خیالات باہر کے طور و طریقہ ان ملکوں میں سوشل اور معاشرتی انقلابات برپا کرتے رہے اور کتنی کروٹیں بدل کر وہاں کے حالات نے موجودہ نشست اختیار کی ہے۔ عرب میں انسان صرف ان مظاہرات قدرت سے آگاہ تھا جو ایک گرم و خشک منطقہ حارہ والے مُلک میں رونما ہوتے ہیں۔ سبزہ زار۔ سمندر۔ موسلا دھار پانی۔ برسات وغیرہ اس قسم کی چیزیں وہاں مفقود تھیں اس لئے وہاں کی ادبی روایات میں ان کا کہیں ذکر نہیں ہے نہ وہاں دربار کی شان تھی۔ نہ افواج و خدم کی نہ وہاں رُوما کے جیسے تماشے تھے نہ ہندوستان کے زرعی وسایل، جیسا مُلک سادہ تھا ویسے ہی لوگ سادہ تھے۔ لیکن چونکہ موت کی بیکسی اور موت کے بعد کی تاریک مدت کا انھیں بھی احساس تھا۔ اس لئے اخلاقی نصائح کی قوت بشرطیکہ نفسیاتی بنیاد پر قائم ہو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو بھی سوچنے اور سمجھنے پر مجبور نہ کر دیتی خصوصاً جبکہ اس کا انعام دنیا میں غنیمت، غلام و کنیز اور عقبیٰ میں جنت اور حور و قصور باور کرائے جائیں۔ ایک فاقہ مست قوم ان ہی وعدوں سے اُبھاری جا سکتی ہے

یہ مُلک تھا، یہ قوم تھی اور یہ اُس کے حالات تھے جب ظہور اسلام ہوا۔ پھر چونکہ عیسائی راہب، عرب موحدین یا حنفاء[1] اور کاہن برابر مکہ اور اطراف میں آتے جاتے تھے۔ اس لئے اُن کے ذریعہ سے مفرد تصورات کا بہم پہونچنا بعید از قیاس نہ تھا۔ بنی اسرائیل کی کہانیاں زبان زد تھیں۔ اصنام پرستی کا اصولی ضعف تھوڑی سی سنجیدہ طبیعت والے پر روشن ہے شاعر اپنے تصورات کی تشکیل اور ترتیب میں آزاد ہے۔ لوگوں میں آنے والے نبی یا مصلح کے چرچے ہمیشہ رہے ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ عیسائی جہاد اور یہودی جہانجات دلانے والے کے انتظار میں تھے۔ لیکن چونکہ نبوت کے لوازم میں فوق البشر عنصر کی ضرورت تھی۔ اور عرب کے نزدیک کلام سے زیادہ اثر کرنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے اگر ایک شخص میں آرٹ (شاعری) فلسفہ۔ تعمیری اصلاح کا شوق اور تدبیر سب ودیعت ہوں اور حالات کی مساعدت سے ہر ایک کے اظہار کا موقع حاصل ہو جائے۔ اور ارادہ کی پختگی اور خود اعتمادی اس کی مساعی میں شامل حال ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیاب نہ ہو

ایک اور بات قابل لحاظ یہ ہے کہ زمانہ رسالت میں 'اعلائے کلمتہ الحق' نہایت محدود پیمانہ پر ہوا۔ فتح مکہ تک تو صرف

---

[1] حنفاء مذہبی متخیلین تھے جو مختلف اکناف عرب میں خاموش زندگیاں بسر کرتے رہے۔ مورخین نے ان میں سے چند کے متعلق جستہ جستہ حالات چھوڑے ہیں۔ منجملہ ان کے ورقہ بن نوفل قریشی۔ زید بن عمر۔ امیہ بن ابی صامت ثقفی زیادہ معروف ہیں۔ ان کے حالات کے متعلق اتنا علم ہے کہ وہ اصنام پرستی سے منحرف تھے ابراہیم کے اصل طریقوں کے جویا تھے۔ مُردہ جانور کا گوشت خون اور بتوں پر کی قربانی نہیں کھاتے تھے۔ نوزائیدہ لڑکی کے دفن کر دینے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ابراہیم کے خدا کی پرستش کرتے ہیں

حوالی مدینہ کے چند قبائل داخل اسلام ہوئے

اس کے بعد دو تین غزوات اور سرایا میں صرف جنگی محکومیت عمل میں آئی۔ مفتوحین جان و مال کے عوض بآسانی چند اصول کی باتوں کو تسلیم کر لیتے تھے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں پھر ایمان کا دنیاوی انعام تمام قوم کو اس کی جانب متوجہ کر دینے کو کافی تھا۔ علاوہ بریں خانہ جنگی کے مقابلہ میں منظم زندگی۔ ڈسپلن اور باقاعدگی کے فوائد۔ قوم بھر کی اخوت یہ سب باتیں وحشی اعرابیوں کو بھی رام کر سکیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اوسط عرب وسیع نظر سے قوم کے مفاد اور دیگر اغراض کی طرف غور کرنے کے قابل ہو گیا بلکہ اُن میں کے سمجھدار لوگ ان تغیرات کو دنیاوی اعتبار سے مغتنم سمجھنے لگے۔ اسلام کی داغ بیل اگر زمانۂ رسالت میں رکھی گئی تو یقیناً استحکام اور قوت عہد خلافت میں بہم پہونچی۔ اس میں جناب عمر بن الخطاب کی شخصیت کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اسلام اگر بڑھایا نہ جاتا اور دوسری قوموں پر مسلط نہ ہوتا تو اپنے ملک کی خشک سرزمین میں بہت جلد کالعدم ہو جاتا۔ اسلام کے دور ارتقا میں اہم منزل کے نشانات یہ ہیں :۔ ہجرت کی کامیابی۔ جنگ بدر۔ جنگ نہاوند جنگ یرموک۔ نظام فاروقی اور امیر ولید کی فتوحات۔ نیم وحشی اقوام کی سیلابی تاخت بالمقابل قائم شدہ تمدنی نظاموں کی دنیا ایک سے زائد بار دیکھ چکی ہے۔ چنانچہ تاتاریوں کا سیلاب ایران و عراق پر۔ کشن اور یوئیچی اقوام کا ہندوستان پر گوتھ اور ونڈال کا روم پر۔ ہُون قبائل کا شمالی یورپ پر تاریخ میں روشن ہے۔ اسلام بالکل قدرتی اسباب کی بنا پر پیدا ہوا بڑھا۔ پھیلا اور زوال پذیر ہوا۔ اس کے کسی دور میں نہ تو غیبی امداد شامل حال ہوئی نہ خدائی غضب نے اسے نیچے گرایا

اب ہم اس تمہید کے بعد اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جس چیز کو خدا کا کلام، باور کرایا گیا ہے اُس میں فی نفسہ ایسا سمجھے جانے کے عناصر موجود ہیں یا نہیں۔ قرآن موجودہ صورت میں بالکل غیر سائنٹفک طور پر مدوّن ہے۔ بنائے ترتیب سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ طویل ترین سورۃ سے ابتدا کی گئی ہے۔ اور سب سے چھوٹی صورت پر اختتام کیا گیا ہے قدیم اہل عرب کو شعرا کا مجموعۂ کلام اور اس کے راوی اسی ترتیب[1] سے یاد تھے۔ چنانچہ خلافت عمر و عثمان میں اسی اصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے

صاحب کلام نے اپنی معنوی تخلیق کی تدوین و ترتیب میں وہی استغنا اختیار کیا جو ہر زمانہ میں (اور اب بھی) باکمال اہل فن سے فطرتاً ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان کو اپنی تعلیم کی ترویج میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اور امت کو کتاب کی حفاظت کے لئے تاکید

---

[1] عرب میں لکھنے کا فن بہت بعد میں عام ہوا لیکن جاہلیت کے شعرا کا کلام حیرت انگیز صحت کے ساتھ محفوظ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں راویوں کا پیشہ بہت عام تھا۔ جس قبیلہ میں شاعر ہوتے تھے اُس میں راوی بھی ہوتے تھے اور وہ لوگ شعرا کے کلام کو مع متعلقہ باتوں کے حفظ کر لیتے تھے جیسے ہندوستان میں بھاٹوں کا پیشہ تھا اور انگلستان میں (Minstrels) منسٹرل کا۔ یہ لوگ اپنی اولاد کو بھی یہ فن تفویض کرتے تھے اسطرح سینہ بسینہ مشہور کلام باقی رہے قرآنی حفاظ بھی اسی نوع میں شمار کئے جا سکتے ہیں

معنوی حیثیت سے تھی نہ کہ خارجی حیثیت سے۔ چنانچہ متعلقہ لوگوں نے اس کی ترتیب میں کوئی خاص کاوش نہیں کی۔ مکی اور مدنی سورتوں میں بین فرق محسوس ہوتا ہے۔ مکی آیات مختصر، بلیغ بلند اور موثر ہیں، مدنی کلام انتظامی۔ آئین سازی اور سیاست مدن کی طرف راجع معلوم ہوتا ہے۔ متکلم کے دنیاوی ماحول اور حالات کا تغیر نفس کلام سے مترشح ہے۔ مثلاً مکی سورتوں میں جبکہ یہود اور نصاریٰ سے سابقہ نہ ہوا تھا۔ اُن کے طریقوں کی تردید کہیں نہیں ہے اگر کہیں ذکر ہے تو نہایت مجمل اور بلا نیش

مدینہ میں یہود سے زیادہ سابقہ پڑا اُن کی طرف سے مزاحمت ہوئی۔ لہٰذا ان کی نسبتاً زیادہ تکذیب۔ اُن کے قصص اور روایات کی طرف پے در پے کنایہ۔ عاد ثمود اور قوم لوط جن کی بستیوں کے کھنڈر جا بجا عرب کی گزرگاہوں پر دکھائی دیتے ہیں اُن سے استنباط

جدال و قتال کے متعلق احکام اُس وقت نازل ہوئے جب فی الواقعہ مدینہ کے قیام میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی ——— قبلہ کے تغیر کی بابت جو احکام صادر ہوئے وہ بھی اسی اصول پر مبنی تھے۔ کیونکہ مکہ کے قیام تک اہل کتاب سے مخالفت کی وجہ پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد حالات بدلنے پر اس کی ضرورت محسوس ہوئی

اسی طرح مصلحت زمانہ کے اعتبار سے قدیم عرب رسموں کا جواز۔ مثلاً حرمت کعبہ۔ حرمت شہود طلاق۔ تعددِ ازدواج۔ غلام و کنیز۔ غنیمت۔ قربانی وغیرہ کے مروجہ قواعد

ابتدائے 'بعثت' میں جبکہ مقصد صرف تبلیغ وحدانیت اور تکذیب شرک تھا۔ اسلوب خطاب نہایت زوردار اور مرغوب کن ہے۔ سننے والوں کے ذہنی اشکال اور طبیعی رجحانات کو نفسیاتی ذرائع سے متاثر کیا گیا ہے۔ چنانچہ خدا کی عظمت و جبروت۔ اور تاریخی واقعات کی ترجمانی۔ مصنوعی خداؤں کی بیچارگی اُن کے طریقوں کی ناہمواری نہایت معنی خیز اور تصویر الفاظ میں پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح مُنکرین کے عذاب کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک عامی کو سر بجیب فکر کر دینے کے لئے بہت موزوں ہے۔ بچے اور ناتربیت یافتہ سخت گیر لوگ جزا اور سزا کی ایسی ہی تصویروں سے اُبھارے جا سکتے ہیں۔ اعلیٰ تر ذہنی پایہ کے لوگوں سے یہ کہدینا کافی ہوتا کہ تمھیں مستقل عزت یا ذلت نصیب ہوگی۔ تمھیں روحانی بلندیاں یا پستیاں حاصل ہوں گی

(باقی)

قاضی محمد عزیز عرفانی (نیوتنوی)

ماہِ آئندہ سے

حضرت نیاز فتحپوری کا ایک مسلسل بے مثل افسانہ بیراگ کا بروگ شائع ہوگا۔

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

عزیزم

تمھاری شاعری سے تمھیں کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن مجھے ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس بہانہ سے کبھی کبھی تمھاری خیریت معلوم ہوجاتی ہے ـــــ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ تم نے کبھی کوئی خط ایسا لکھا ہو جس میں کوئی غزل ملفوف نہ ہو اور اصلاح کی خواہش نہ کی گئی ہو ـــــ پھر اسی کے ساتھ میں تمھارے صبر و استقلال کا بھی قائل ہوں کہ میں نے کبھی تمھاری خواہش پوری نہیں کی، لیکن تم نے کبھی مایوس ہوکر اس سلسلہ کو ختم نہیں کیا ـــــ تاہم یہ سوچتا ہوں کہ آخر کب تک میں ٹالتا رہوں گا اور تمھیں کب سمجھ آئے گی کہ میری خاموشی کو اور کچھ نہیں تو میری نااہلی ہی پر محمول کرو

تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں شعر و شاعری ایک زمانہ ہوا ترک کر چکا ہوں اور مشکل ہی سے کسی کا کوئی شعر مجھے پسند آتا ہے۔ اس کو میرے معیار کی بلندی کہو، خبط کہو، بے حسی سے تعبیر کرو، بہرحال جو کچھ سمجھو واقعہ یہ ہے کہ میرا دل اس فن سے اچاٹ ہوچکا ہے اور دل و دماغ کے سامنے اور اتنے اہم مشاغل موجود ہیں کہ اس طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا ـــــ پھر اسی کے ساتھ جب تمھاری غزلوں کو دیکھتا ہوں تو اُن میں اصلاح کی بھی کوئی گنجایش نہیں پاتا کیونکہ اصلاح کا مقصود تو جابجا اسقام کو دُور کرنا ہے، لیکن جس غزل میں تلاش سے بھی کوئی معقول بات نظر نہ آئے۔ اس کی اصلاح تو صرف اسی طرح ممکن ہے کہ از سر نو دوسری لکھ دی جائے، پھر بتاؤ کیا مجھے سودا ہے کہ میں خواہ مخواہ تمھیں غزلیں کہہ کہہ کر دیا کروں اور تم کو فریب نفس میں مبتلا کروں جس کی خیر سے یوں بھی تم میں کوئی کمی نہیں ـــــ پاگل ہوئے ہو، اپنا کام کرو اور اس خبط کو چھوڑو۔ نہ تمھاری تعلیم پوری، نہ تمھاری صحبت معقول، نہ تمھارا ماحول ٹھکانے کا، پھر جو یہ خبط تم پر سوار ہوا ہے سو کیوں ؟

اگر تم کو میرے ساتھ کوئی علاقہ ایسا ہے جو کبھی کبھی خیریت لکھنے اور دریافت کرنے پر مجبور کرسکتا ہے تو اس قسم کی مراسلت میرے لئے یقیناً باعث مسرت ہوسکتی ہے، لیکن محض "غزلبازی" کے لئے کیوں اپنے پیسوں کا اور میرے دل کا خون کرتے ہو

نیاز

میر صاحب قبلہ

خط ملا۔ دلپرسی کا شکریہ۔ آپ مجھ سے تفصیل چاہتے ہیں۔ حالانکہ مجھ میں "اجمال" کی بھی تاب نہیں ——— آپ کے جواں بخت وجواں سال تلمیذ اجلّ، یعنی آپ کی مملکت شعر وسخن کے "مہاراجکمار" کی تحریر جو انھوں نے اجے گڈھ لکھی تھی میرے پاس بھیجدی گئی ہے۔ کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں، کیا کیا "برشِ تیغِ جفا" پر ناز فرمایا ہے۔ جلّ وصلّ

ان کو میرے آپ کے تعلقات معلوم، وہاں میری پوزیشن اُن پر روشن، علاوہ بریں اس تمام ماحول سے آگاہ جس میں زندگی بسر کر رہا ہوں، لیکن اللہ رے غرورِ حسن وجوانی کہ بے دھڑک پیغام بھیج دیا۔ اور میری برائی میں اپنی کامیابی سمجھ کر جھوٹ کا طومار باندھ دیا ——— یقیناً میں اس تعلق کا مخالف تھا اور ہوں لیکن خدارا اُن سے پوچھئے کہ اس سے خود میری کیا غرض متعلق تھی

انھوں نے میرے رسوخ سے خواہ مخواہ جذبۂ رقابت پیدا کر لیا۔ اور ظاہر ہے کہ "رقیب روسیہ" کو ایک شاعر گالیاں نہ دیگا تو اور کیا کرے گا ——— بہرحال اس سے میرا نقصان تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوا کہ تھوڑی سی ندامت وخفت اُٹھانا پڑی، لیکن اُن کے لئے کامیابی کی اب کوئی ادنیٰ سی صورت بھی باقی نہیں رہی ——— کہئے تو ان کا اصل خط روانہ کر دوں؟

آپ کے تو وہ محبوب شاگرد ہیں، آپ ہی سمجھائیے کہ جوانی میں تھوڑا سا دیوانہ پن تو خیر ہونا ہی چاہئے، لیکن یہ "باجی پن" کیسا؟

نیاز

گفتی کہ چرا حالِ دلِ زار نہ گوئی
من خود کنم آغاز چو پایاں کہ رساند؟

آپ کیا اس سے زیادہ تفصیل چاہتے ہیں، اس سے زیادہ سننے کے متمنی ہیں؟ آہ،

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

یہ نہ پوچھئے کہ جو کچھ ہوا کیونکر ہوا بلکہ یہ سوچئے کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے۔ مجھ میں تو اتنی سکت بھی نہیں کہ مستقبل کی تاریکی کا خیال تک دل میں لا سکوں۔ جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر کسی ایسی دنیا میں چلا جاؤں جہاں کم از کم آزادی سے رو تو سکوں ——— یہاں تو یہ بھی ممکن نہیں ——— دم گھٹتا ہے، جی اُلجھتا ہے اس کے خیال سے اُس کے خیال سے ساری دنیا کے خیال سے ——— پھر لطف یہ کہ مجھے خاموش دیکھ کر بعض سنگ دل کہتے ہیں، بعض صبر وضبط کی داد دیتے ہیں۔ اور یہ خبر کسی کو نہیں کہ جب کلیجہ سے دھواں سا اٹھتا ہے تو میرا کیا عالم ہوتا ہے

آپ فرماتے ہیں کہ چند دن کے لئے کسی اور جگہ چلا جاؤں۔ مشورہ مناسب ہے، لیکن کوئی تدبیر ایسی بتائیے کہ دل ودماغ

میرے یہیں رہ جائیں۔ ورنہ یوں کہیں جانا بیکار ہے

جانتا ہوں کہ رفتہ رفتہ یہ غم بھی کم ہو جائے گا، چند دن اور اس نیش کی لذت اٹھا لینے دیجئے

سوگوار۔ نیاز

خوب، اندازِ بیان ہی وہ چیز ہے جس سے شاعر کے صحیح جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ بولنے میں لب و لہجہ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، لیکن تحریر میں تو یہ کام انداز بیان ہی سے لیا جا سکتا ہے

فارسی میں خدا جانے کتنے غزل گو شعرا گزر چکے ہیں، لیکن جذبات محبت کو پوری صداقت و سادگی کے ساتھ بیان کرنے میں سعدی کی انفرادیت اپنی جگہ قائم ہے۔ یہی حال اُردو میں میر کا ہے۔ پھر یہ کرشمہ اندازِ بیان کا نہیں تو کس بات کا ہے؟ مومن کا رشک آمیز سوز، غالب کا شوخ و ذہین تعشق، خواجہ میر درد کی والہانہ ربودگی، ان سب کی تفریق انداز بیان ہی سے تو ہوتی ہے ورنہ یوں کون سا ذریعہ تعیین و امتیاز کا ہے ——— اسی لئے میں نے کہا کہ ایک نقاد کا مختلف "اسالیب بیان" سے آگاہ ہونا اور اُن کو دیکھ کر شاعر کے جذبات پر حکم لگانے کی اہلیت رکھنا از بس ضروری ہے

مشہور شعر ہے:۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

کتنا پیارا شعر ہے، لیکن اس کو صرف نقاد ہی سمجھ سکتا ہے کہ پہلا مصرعہ صرف مطلع بنانے کے لئے لکھا گیا ہے ورنہ صحیح رنگِ تغزل کا اقتضاء کچھ اور تھا

آپ کسی کے سامنے صرف دوسرا مصرعہ پڑھئے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ شاعر نے اس میں اپنے محبوب کا ذکر کیا ہے جو اسی دنیا سے متعلق ہے۔ لیکن جب آپ پورا شعر پڑھیں گے تو اس کا خیال دوسری طرف منتقل ہو جائے گا۔ اور دوسرے مصرع کا خطاب جو پہلے اس نے سمجھا تھا۔ اب بالکل بدلا ہوا نظر آئے گا۔ کیونکہ دنیاوی محبوب کا تعلق نہ کون و مکان سے ہے۔ اور نہ کاروبار محبت میں اس کے ذکر کی ضرورت ——— اس لئے یہ شعر تو اپنی جگہ مکمل ہے لیکن اس رنگ سے ہٹا ہوا ہے۔ جو دوسرے مصرعہ کا اقتضاء تھا۔ اور یہ فرق پیدا کر دیا صرف لفظ جلوہ اور کون و مکاں نے اگر پہلے مصرعہ سے کچھ اس طرح کا مفہوم پیدا ہوتا کہ

وہ میری روح میں ہیں، نظر میں ہیں، دل میں ہیں
یا ——— دل میں جمے ہوئے ہیں، نظر میں بسے ہوئے
یا ——— اپنی نگاہِ شوق پہ ہے مجھ کو اعتماد

تو یہ شعر حدودِ تغزل میں رہتا گو اعلیٰ معیار کا پھر بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ دوسرے مصرعہ کے اندازِ بیان میں جو انانیت وطنز پنہاں ہے وہ شعر کو بلندی کی طرف سے پستی کی طرف کھینچ رہا ہے

تقریباً اسی مفہوم کا ایک شعر عربی کا یاد آگیا ، دیکھئے اسی جذبہ کو کس والہانہ انداز سے ظاہر کیا ہے :۔

جمالُک فی عینی وحبُّک فی قلبی

وذکرُک فی فمی فاین تغیب

یعنی ـــــ اے تو وہ کہ تیری صورت آنکھوں میں بسی ہوئی ہے ، تیری محبت دل میں سمائی ہوئی اور تیرا ذکر ہر وقت زبان پر ہے تو کہاں مجھ سے چھپ کر رہ سکتا ہے

اب غور کیجئے کہ اندازِ بیان نے اسی مفہوم کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ سورداس کے اس دوہے کو دیکھئے :۔

ہاتھ چھڑائے جات ہو نبل جان کے موئے

ہردے میں سے جاؤ گے تو مرد بدونگی توئے

یعنی ـــ مجھے کمزور جان کر زبردستی ہاتھ چھڑا کے چلے جا رہے ہو لیکن میرے دل سے نکل جاؤ تو جانوں کہ بڑے مرد ہو۔ ہرچند اس میں بھی ہلکی سی کیفیت طنز کی ہے لیکن اندازِ بیان نے اس میں بھی خاص فتادگی پیدا کر دی ہے

بہرحال میری رائے تو یہی ہے کہ شاعری میں اصل چیز اندازِ بیان ہے۔ اگر آپ کے نزدیک بلندیٔ مضمون کوئی اور چیز ہے اور سب سے زیادہ اہمیت وہی رکھتی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں ، کیا کر سکتا ہوں ، جبکہ اس زمانہ میں غزل کا معیار تصوف وفلسفہ طرازی کے بہانہ سے صرف مہمل گوئی قرار پا گیا ہے

نیاز

بیدل ! ہائے بیدل ! وائے بیدل !! آپ نے بھی کیا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کمبخت میں فارسیت ہو یا نہ ہو ، لطفِ زبان پایا جائے یا نہ پایا جائے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ تخیل کا بادشاہ ہے ، ندرتِ بیان کا خدا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک رندِ ولیدہ مو ہے ، جو لفظ اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ دل میں تیر وسناں کی طرح پیوست ہو جاتا ہے

ہر کجا نکہت گل پیرہن رنگ ورو

نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے میخواہد

پھول کو " پیرہنِ رنگ " کہنا اور نکہت کو گل کی " جامہ دری " حسنِ تعبیر کی وہ حد ہے جہاں نہ نظیری کی رسائی ہے نہ حافظ کی اور " از خود سفرے می خواہد " تو وہ اندازِ بیان ہے جسے بہت سے ناواقف صرف مغربی لٹریچر کی خصوصیت سمجھے ہوئے ہیں

نکات و چہار عناصر پر کیا موقوف ہے، اس کا تو ایک ایک لفظ حرزِ جاں بنانے کے قابل ہے۔ مثنویاں دیکھئے، رقعات کا مطالعہ کیجئے، قطعات و رباعیات پر سر دُھنئے، لیکن زبان نہ کھولئے، کون سمجھتا ہے اور کسے سمجھنے کا ہوش ہے۔ وہ خود کہہ گیا ہے کہ

چہ رسد نشۂ معنوی بہ دماغِ بے حس و بے خبر
زپری پیامے اگر کشی بہ دُکانِ شیشہ گراں مبر

نیاز

بندہ نواز،

شکر ہے آپ نے مجھے پوچھا، لیکن اُس وقت جب

شایانِ دست و بازو قاتل نہیں رہا

پھر تماشہ یہ ہے کہ اگر میری طرف سے " اعتراف " میں کمی ہوگی تو آپ مجھی کو موردِ الزام قرار دیں گے، آجا

کمند کوتہ و بازوئے سُست و بام بلند
بمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند

واقعہ یہ ہے کہ میں اب کسی قابل نہیں رہا۔ " بندۂ بگریختہ " نہیں بلکہ " بندۂ معذور " جان کر میرے پاؤں کی زنجیر کاٹ دیجئے۔ اربابِ کرم کا یہی شیوہ ہے۔ ورنہ یوں مجھے امتثالِ امر میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ حاضر ہوں گا اور سر کے بل حاضر ہوں گا، لیکن ڈرتا ہوں کہ مبادا میری وجہ سے آپ کی محفلِ نشاط میں افسردگی پیدا ہو اور ایک داغِ ناکامی اور لے کر وہاں سے واپس ہوں

نیاز

آپ بھی عجیب چیز ہیں —— پریشانیوں کی شکایت خدا سے کرتے ہیں جہاں تاثر و انفعال کا گزر ہی نہیں۔ ہر بدنصیب شخص اپنی جگہ یہی باور کرتا ہے کہ جو مصائب اس پر نازل ہوئے ہیں وہ انتہائی مصائب ہیں اور اُس سے زیادہ مظلوم دُنیا میں کوئی نہیں —— لیکن اسے کیا خبر کہ قدرت کے ترکش میں کیسے کیسے زہریلے تیر پنہاں ہیں اور وہ کس کس طرح اُن سے کام لیتی ہے —— درد و بیچارگی کی کوئی انتہائی صورت قیاس کر لو، لیکن واقعتاً اس سے بھی زیادہ الم انگیز صورتیں پیدا ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ فطرت کا نظام ہی یہ ہے

مذہب کی تلقین اس باب میں صرف اس حد تک مفید ہے کہ انسان صبر و ضبط کا عادی ہو جاتا ہے۔ ورنہ دعا

واستجابتِ دعا معلوم ! تدبیر کے بن پڑنے کا نام "قبولِ دعا" ہے، اور جب کچھ نہیں بن پڑتی تو اہل مذاہب اس کو "مصلحتِ خداوندی" سے تعبیر کرتے ہیں، یہ سب الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقت کچھ نہیں ——

یقیناً آپ کی مایوسیاں اس طرح سے اور زیادہ بڑھ جائیں گی، لیکن کیا کروں۔ صبر وضبط کی لایعنی تلقین میرے بس کی بات نہیں۔ میں کیوں وہ بات کہوں جسے کھلا ہوا فریب سمجھتا ہوں۔ مگر ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تدابیر سے غافل نہ رہیئے، دُنیا میں جب تک زندہ رہنا ہے اسی طرح مخالف قوتوں کا مُقابلہ کرنا پڑے گا، کبھی آپ کامیاب ہوجائیں گے اور کبھی مغلوب —— لیکن مغلوب ہوجانا ہتیار ڈال دینا نہیں ہے، اس لئے ہاتھ پاؤں چلائے جائے اور میرے کرنے کی جو بات ہو اس سے مطلع فرمائیے۔ محض غم وغصہ بیکار بات ہے اور دعا اس سے زیادہ بیکار

نیاز

محترم

نامۂ گرامی ملا —— آج کل یہاں کا موسم خودکشی کی حد سے شاید ہی ایک آدھ ڈگری کم ہو۔ ظاہر ہے کہ نینی تال کے رہنے والے اس وقت بہشت میں ہیں۔ لیکن مجھ کافر کا وہاں گزر کیونکر ہو —— بہرحال جنت والوں کو میرا اسلام پہونچے اور حسرتِ نارسائی —— مضامین کا منتظر ہوں

نیاز

اڈیٹر صاحب نگار کی رائے
خضاب بلیک ڈائمنڈ کے متعلق

اڈیٹر صاحب نگار فرماتے ہیں :——

"اس میں شک نہیں کہ عام طور پر جو خضاب طیار ہوتے ہیں ان میں ڈایامین کا جزو شامل ہوتا ہے جو آہستہ زود مگر نہایت مہلک قسم کا زہر ہے اور اسی لئے اب لوگوں میں اس کی مضرت کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ خضاب بلیک ڈائمنڈ کے مالک نے اپنا خضاب میرے سامنے طیار کرکے دکھایا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اسمیں واقعی کوئی مضرت رساں جز شامل نہیں ہے۔ تجربہ سے اسکا رنگ بھی نہایت پختہ سیاہ ثابت ہوا اور جلد پر دھبہ بھی باقی نہیں رہتا"

کیا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت ہمارے خضاب کی عمدگی کا ہو سکتا ہے ؟ قیمت فی شیشی عہ (علاوہ محصول)، تین شیشیاں طلب کرنے والوں کو محصول میں بہت کفایت ہو سکتی ہے ——

منیجر کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

باب الانتقاد

اصغر کے سو شعر

دہلی کے مکتبۂ جامعہ نے ایک نیا اور نہایت دلچسپ سلسلہ مشاہیر شعراء کے انتخاب کلام کا شروع کیا ہے اس سلسلہ کے دو پمفلٹ جن میں اصغر و جگر کے سو سو شعر انتخاب کر کے درج کئے گئے ہیں۔ بغرض ریویو ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ اور آج کی صحبت میں ہم اصغر کے انتخاب کلام پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں :۔

انتخاب کرنے والے کوئی بزرگ محمود علی خاں صاحب ہیں اور جس اصول کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق خود انتخاب کنندہ کے الفاظ یہ ہیں :۔

> " اس مجموعہ میں حضرت اصغر کے ایک سو منتخب اشعار درج ہیں جو لطافت بیان، اور حکیمانہ مضامین سے مالا مال ہیں، خصوصاً تصوف و حکمت، علم و عرفان، اسرار و معارف، ذوق مشاہدہ، افشائے راز، جمال دوست، احساس خودی، اور حقایق نگاری وغیرہ کے چیدہ اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اور آخر میں الفاظ میں مصوری کے چند نمونے بھی درج کئے گئے ہیں "

قبل اس کے کہ اصغر کے کلام پر غور کیا جائے یہ امر ضروری ہے کہ انتخاب کنندہ کے اصولِ انتخاب کو سمجھ لیا جائے۔ اور نیز یہ کہ وہ اصول بجائے خود درست بھی ہے یا نہیں ؟

غالباً اس جگہ یہ بحث موزوں نہ ہوگی کہ تغزل میں " تصوف و فلسفہ " کے شمول کی بدعت کب اور کیوں رائج ہوئی، لیکن اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ " تصوف و فلسفہ " جسے آج کل غزل گوئی کا معیار بلند سمجھا جاتا ہے حقیقتاً کیا چیز ہے ——— میں اگر انتخاب کنندہ سے یہ سوال کر بیٹھوں کہ حکیمانہ مضامین سے ان کی کیا مُراد ہے، تصوف و حکمت کسے کہتے ہیں، علم و عرفان، اسرار و معارف سے ان کا کیا مقصود ہے، ذوقِ مشاہدہ، افشاء راز اور احساس خودی کیا بلا ہے، تو وہ غالباً اس کا جواب نثر میں تو نہ دے سکیں گے، ممکن ہے کسی شاعر کا کوئی شعر پڑھ دیں گے کہ دیکھو یہ ہے حکمت

وتصوف وغیرہ وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے شعراء اور اُن کے بعض ہواخواہ ناقدین نے چند الفاظ یاد کر لئے ہیں۔ جو لغت کے اعتبار سے خواہ کچھ مفہوم رکھتے ہوں، لیکن غزل گوئی کی دنیا میں ان کا اصطلاحی مفہوم کوئی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ سننے والا ان الفاظ سے مرعوب ہو کر شعر کی داد دینے پر مجبور ہو جائے

یقیناً "تصوف" کے کچھ مخصوص اعتقادات ہیں، بعض معین نظریے ہیں، اور اس میں بھی کلام نہیں کہ الٰہیات کی بعض گتھیوں کو جن میں سے سب سے زیادہ الجھی ہوئی چیز "خدا اور خدا کا مفہوم" ہے، اس نے بوجہ احسن سلجھایا ہے، لیکن "غزل" سے ان باتوں کو کیا واسطہ۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا، یعنی اس غلطی کی ابتدا شاعروں کی طرف سے ہوئی یا صوفیوں کی طرف سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں شاعروں کا دامن آلودہ نہیں ہے بلکہ اس بدعت کے مخترع ہمارے اربابِ تصوف ہی ہیں

بزمِ سماع منعقد ہے، صاحبِ سجادہ مع تمام اُن ظواہر و علامات کے جو اظہارِ تقدس کے لئے ضروری ہیں۔ صدر میں جلوہ افروز ہیں، ارادتمندانِ نیایش کیش مؤدب سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں، سامنے مزار پر زرکار چادریں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں، عُود و صندل کے بخور سے فضا معطر ہو رہی ہے۔ اور

مطرب، بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے!

"سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی" سامنے موجود ہیں، شراب اور مغبچوں کا ذکر دلوں میں گرمی پیدا کر رہا ہے، حافظ کی غزلیں گا گا کر زاہد کی پگڑی اچھالی جا رہی ہے، روزہ و نماز کی توہین ہو رہی ہے، کعبہ و حرم پر بتکدہ و میخانہ کو ترجیح دی جا رہی ہے، اور علی الاعلان کہا جا رہا ہے کہ

از قول زاہد کردیم توبہ
وز فعل عابد استغفر اللہ

دعوتِ رقص و شراب کھلم کھلا دی جا رہی ہے کہ

عید ست و موسمِ گل ساقی بیار بادہ
ہنگامِ گل کہ دیدہ ست بے مے قدح نہادہ

اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ تقدس مذہبی کو دفترِ بے معنی کہکر "غرقِ مئے ناب" کر دینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے ——

پھر، مجلس میں اگر سوا ارادتمند ہیں تو دو چار سوچنے سمجھنے والے بھی ہیں۔ آپس میں سرگوشیاں ہوتی ہیں کہ زہد و اتقا کی یہ تعلیم کیسی ہے کہ دین و مذہب ہی کو بُرا کہا جا رہا ہے، اخلاق کا یہ کیسا درس ہے جس میں سوائے ساقی و شراب کے کسی اور چیز کا ذکر ہی نہیں —— رفتہ رفتہ صاحبِ سجادہ کے کانوں تک بھی یہ بات پہونچتی ہے اور پھر جو فلسفہ "ہویت" "بروئے کار

آتا ہے تو نوبت یہاں تک پہونچ جاتی ہے کہ " ساقی " خدا ہو جاتا ہے اور شراب " کوثر " بتکدہ " دل قرار پاتا ہے جو مہبطِ انوارِ الٰہی ہے اور " معشوق " کا مسٹی وہ پیرِ کہن سال، جس کے ہاتھ پر بیعتِ توبہ و سلوک کی جاتی ہے

یہ ہیں حقایق و معارف اور اسرار و غوامض کے وہ مظالم جو غریب شاعری کی جانِ ناتواں پر اوّل اوّل توڑے گئے اور پھر رفتہ رفتہ یہ بدعت اس قدر عام ہوئی کہ محبت کی ایک قسم ہی علٰحدہ ہو گئی جسے " عشقِ حقیقی " کہتے ہیں اور ایک اچھے اور بلند شعر کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں رہ گیا کہ نہ خود شاعر سمجھ سکے۔ نہ کسی اور کو سمجھا سکے

حقیقتاً غزل نام ہے صرف جذباتِ محبت کو جو اسی دنیا اور اسی دنیا کے معشوق سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ نہایت صاف و سادہ زبان میں ادا کر دینا۔ پھر اس سے ہٹنے کے بعد ایک شعر، چاہے " کلام اللہ " ہو جائے لیکن تغزل تو اس میں رہتا نہیں

" عشقِ حقیقی " کیا ہے ؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کیا ہے ؟ اور ظاہر ہے کہ خدا کو شاعری سے کیا واسطہ ؟ یا شاعری کو خدا سے کیا تعلق ؟

محبت نام ہے اس خاص کیفیت کا جو گوشت و پوست کی زندگی میں کسی تعلق خاطر کی بناء پر پیدا ہوتی ہے اور اس کیفیت کا اظہار غزل ہے۔ پھر ممکن ہے کہ ایک صوفی جو اخلاق و مذہب کی آڑ میں شکار کرنا چاہتا ہے وہ اس کو پسند نہ کرے اور کسی ایسی تاویل پر مجبور ہو جائے۔ جو اس کے تقدس کا بھرم رکھنے والی ہو، لیکن شاعر کو کیا غرض کہ وہ اس کی رعایت سے اپنی زبان بدل دے ——— پھر حافظ اور اس کے بعد بھی کچھ اور شاعر ایسے نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور کھلم کھلا وہی کہتے رہے جو انھیں کہنا تھا۔ خواہ ایک صوفی کا دماغ تاویلیں کرتے کرتے بیکار ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن بعد کو جب مسلمانوں میں قوتِ عمل اور زیادہ ضعیف ہو گئی، عام قومی انحطاط نے فکر صحیح سے ان کے دماغوں کو بیگانہ کر دیا اور جہل و لاعلمی نے خانقاہوں کی گرم بازاری کو تقویت پہونچائی، تو شاعر بھی اپنی منزل سے نیچے اُتر آیا، اس نے بھی اپنی زبان بدل دی اور آخر کار اس نے وہ الفاظ بھی ترک کر دئے جن کی تاویل کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ یعنی اب وہ بھی عشقِ حقیقی کے چکر میں آگیا اور تصوف کی اُن بہت سی اصطلاحوں کو جن کا کوئی حقیقی مفہوم نہیں ہے، وہ اپنی شاعری میں صرف کرنے لگا ——— خیر پہلے تو ایک صوفی کسی غزل کی تاویل کر کے اپنے رنگ میں اسے کھینچ لاتا تھا، لیکن اب ایک عاشق کے لئے یہ تاویل بھی ممکن نہیں رہی۔ کیونکہ جب تک خدا کو ساقی کے نام سے پکارا جاتا تھا، رند کے لئے یہ موقعہ تھا کہ وہ فضول آوازوں کی طرف سے اپنے کان بند کر کے ساقی کو ساقی ہی سمجھے، لیکن جب ساقی کو بھی خدا کہا جانے لگا تو ظاہر ہے کہ " رند جز نوش " سوائے جان دیدینے کے اور کیا کر سکتا تھا

تصوف یا تصوّف کی شاعری میں جن چیزوں کو اسرار و معارف، علم و عرفان وغیرہ بہت سے مہمل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے وہ صرف دو نظریوں میں محدود ہیں۔ ایک یہ کہ خدا ہر جگہ اور ہر چیز میں ساری و طاری ہے اور دوسری

یہ کہ اس کی کُنہ حقیقت دریافت کرنے سے انسان عاجز ہے ——— ظاہر ہے کہ یہ نظر نے کسی "علم قطعی" (Positive Science) سے تو تعلق رکھ نہیں سکتے، کیونکہ ان دو نظریوں میں سے ایک میں خود ہی جہل و عجز کا اعتراف ہے اور دوسرا جسے نظریۂ "ہوئیت" یا "وحدۃ الوجود" کہتے ہیں ایک ایسی تعبیر ہے جسے ایک خیال پرست شخص تو مان سکتا ہے لیکن علم کو درجۂ یقین تک پہونچانے والوں کے لئے اس میں زیادہ سامان دلچسپی موجود نہیں ——— پھر جب تصوف کی بنیاد ہی ایسے مجہول نظریوں پر قایم ہے تو اس میں اسرار و غوامض یا علوم و معارف کیا ہو سکتے ہیں، اور ایک شاعر اُن کے اظہار میں وہ کونسی بات پیدا کر سکتا ہے جو جوش و ولولہ کی حامل ہو

اس نوع کے شاعروں میں سب سے بلند مرتبہ بیدلؔ کا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی اسی عالم حیرت و استعجاب میں بسر کردی جو فلسفۂ "ہوئیت" نے اس پر طاری کر دیا تھا، لیکن کیا اس کی قدر غزل گوئی کے لحاظ سے کی جاتی ہے، کیا وہ اپنے رنگِ تغزل کی وجہ سے کامیاب شاعر کہلایا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں

اس کی کامیابی کا راز صرف اس کا اندازِ بیان، تنوع تعبیرات، اور علوئے تخیل ہے، جو انسان کی قوتِ متخیلہ کو مسحور کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ علاوہ بیدلؔ کے اس وقت تک کوئی دوسرا شاعر اس رنگ کا پیدا ہوا ہے؟ ——— اس نے غزل گوئی ترک کر کے جس شاعری کی بنیاد ڈالی، اس کے لئے اس نے ایک زبان بھی علیحدہ وضع کر دی اور یہ وہ خصوصیت تھی جس نے اس کو ایک مخترع و مُبدع کی حیثیت سے دنیا میں پیش کیا اور اس اختراع و ابداع کو وہ اپنے ہی ساتھ لے گیا ——— دوسرا راز بیدلؔ کی کامیابی کا یہ تھا کہ وہ فارسی زبان میں شاعری کرتا تھا جو اُردو کے مقابلہ میں زیادہ وسیع، زیادہ لطیف و شیریں اور زیادہ ایجاز کی گنجایش رکھتی ہے۔ اس لئے اُردو میں اگر اس کا تتبع کیا بھی جائے تو کامیابی ممکن نہیں کیونکہ اول تو بلند سے بلند خیال کوئی ایسا نہیں جو بیدلؔ کی دسترس سے باہر رہا ہو اور دوسرے یہ کہ اُردو میں الفاظ کی کمی اور حروف روابط کی زیادتی نے اس کو محال بنا دیا ہے

بہرحال اُردو میں غزل کو تصوف و حکمت سے گرانبار کرنے کی رسم فارسی سے آئی ہے اور آنی چاہیئے تھی، کیونکہ اُردو شاعری یکسر فارسی کی نقل ہے جس میں مسلمانوں نے کبھی کوئی مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ مسلمانوں کی یہ ملعون ذہنیت کہ وہ ہندوستان میں ایک اجنبی فاتح کی حیثیت سے آئے اور کفرستان ہند سے اپنے آپ کو منسوب کرنا اُن کی توہین ہے۔ کب اُن کو یہاں کی شاعری کا تتبع کرنے کی اجازت دے سکتی تھی۔ اور وہ کیوں بلبل کو چھوڑ کر کویل اور پپیہا کی طرف آ سکتے تھے، اسی طرح چونکہ ایرانی امر دپرستانہ شاعری حلقۂ زہد و اتقا میں قدم قدم پر تاویلوں کی محتاج تھی، اس لئے اُردو میں بھی وہی رنگ پیدا ہو گیا۔ اور "عشقِ حقیقی" والی لغو و مہمل ذہنیت یہاں کے شاعروں میں بھی پیدا ہو گئی جس کو اسرار و معارف اور فلسفہ و حکمت کا خزینہ بنایا جاتا ہے

اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ تصوف نے جو تصورِ خدا (Conception of God)

پیش کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور انسان عجز و نارسائی اور حیرت و استعجاب کے اعتراف کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا، تو بھی خدارا کوئی بتلائے کہ اس میں عشق و محبت کی کون سی بات ہے اور خدا سے عشق کرنا کیا معنی ؟ اسی سلسلہ میں نعت گوئی کا بھی رواج پیدا ہوا یعنی عشق حقیقی میں خدا کے ساتھ رسول کو بھی شامل کرلیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل گوئی بد سے بدتر ہوگئی، کیونکہ جب تک محض خدا کا معاملہ تھا، انسانی تشبیہات و استعارات لامحالہ تاویل طلب تھیں، اور ذہن دنیاوی مُعاملات محبت کی طرف منتقل نہ ہوسکتا تھا، لیکن رسول کے شامل ہوجانے سے جو فی الحقیقت ایک انسان تھے، ان خیالات نے اور زیادہ رکیک صورت اختیار کرلی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ کی کھلم کھلا توہین ہونے لگی۔ کیونکہ انھیں الفاظ کو جو دُنیاوی حسن و عشق کے لئے معمولاً استعمال کئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ کی ذات گرامی کے ساتھ منسوب کیا گیا اور اس کی رکاکت و سخافت ظاہر ہے ——— میں یہ نہیں کہتا کہ ہر شاعر کی نعت گوئی کا معیار اتنا ہی پست و ذلیل تھا۔ لیکن بلند معیار والوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ ان کا ذکر کرنا ہی فضول ہے

اب یہاں دو اعتراض ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ اگر عشق حقیقی کو اڑا دیا جائے تو جذبات میں بلندی و پاکیزگی کیونکر پیدا ہوسکتی ہے اور دوسرے یہ کہ اگر علاوہ جذباتِ محبت کے شعر میں دیگر تاثرات کا اظہار کیا جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور اس کو شعر کیوں نہ کہا جائے ؟

پہلا اعتراض بالکل مہمل ہے، کیونکہ جذبات کی بلندی اس پر منحصر نہیں ہے کہ وہ کس سے وابستہ ہیں بلکہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کیا ہیں۔ اگر عشق حقیقی کرنے کے بعد بھی کوئی شخص رکیک الفاظ میں رکیک جذبات کے اظہار پر آمادہ ہوجائے تو اُسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اگر عشق مجازی کے بعد کوئی شخص پست خیالات سے علیحدہ رہے تو اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے ——— اصل چیز جو بلندی و پستی پیدا کرنے والی ہے وہ شاعر کی ذہنیت ہے۔ اگر اس کی ذہنیت بلند نہیں ہے تو اس کا عشق حقیقی بھی بیکار ہے اور اگر اس کی ذہنیت واقعی بلند ہے تو وہ گوشت و خون کے جذبات میں بھی پاکیزگی کا رنگ پیدا کرسکتا ہے، جیسا کہ اُردو کے بعض مشہور اساتذۂ شعر کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے

رہ گیا دوسرا اعتراض۔ سو میں کبھی اس پر مُصر نہیں کہ علاوہ جذبۂ محبت کے کسی اور تاثر یا حقیقت کا اظہار شعر میں نہ ہونا چاہیئے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو غزل کیوں کہا جائے۔ مثنویاں لکھئے، قطعات لکھئے، رُباعیات لکھئے، قصائد و دیگر منظومات میں طبع آزمائی کیجئے کون روکتا ہے، لیکن غزل کو صرف عشق و محبت کے لئے مخصوص رہنے دیجئے اور اس غریب کو کھینچ کر "قاب قوسین" کی حد تک نہ لے جائیے جہاں قال کی نہیں بلکہ صرف حال کی ضرورت ہے

غزل نام ہے صرف اُن جذبات و تاثرات کے اظہار کا جو دنیاوی عشق و محبت میں قلبِ انسانی کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور اظہار بھی اسقدر سادگی کے ساتھ کہ بغیر کسی کاوش و تاویل کے ذہن سامع پر چھا جائے۔ اگر یہ جذبات ذلیل و ردی ہوں گے مثلاً "مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں" یا ——— "دو بوسے لوں گا جانِ حسن ایک اس طرف ایک اس طرف"

تو یقیناً ہم اسے غزل کی توہین کہیں گے اور اگر اندازِ بیان کے لحاظ سے وہ " رشحۂ ہر شمع خارکسوتِ فانوس " ہے تو بھی یقیناً اسے تغزل سے خارج سمجھنا پڑے گا۔

پھر چونکہ کار و بارِ محبت میں نہ تاثرات کی کوئی انتہا ہے نہ اندازِ بیان کے تنوع کی ، اس لئے استعارات و تشبیہات ، کنایات و محاکات وغیرہ کے امتزاج سے ایک نہایت وسیع میدان شاعر کے سامنے آجاتا ہے جس میں وہ اپنے تخیل و تخییل دونوں سے مدد لے کر بہت کچھ جولانیاں دکھا سکتا ہے اور وہ قطعاً ان تمام مفروضہ اسرار و معارف کے اظہار پر مجبور نہیں جنھیں اربابِ تصوف کے تاویلی عشق حقیقی سے منسوب کیا جاتا ہے

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ صرف اس تحریر سے متاثر ہو کر لکھا گیا جو محمود علی خاں صاحب نے اپنے دیباچہ میں " تصوف و حکمت " کے متعلق درج کی ہے اور جسے اپنے پندار میں نہایت بلند معیارِ تغزل سمجھ کر اصغر کے کلام کو اس پر منطبق کرنا چاہا ہے

ہر چند جس معیار کو قائم رکھ کر انتخاب کنندہ نے یہ مجموعہ پیش کیا ہے وہ اس قدر تمہید کے بعد محتاج تنقید باقی نہیں رہتا کیونکہ اگر واقعی اصغر کے ایسے ہی اشعار انھوں نے چُنے ہیں جن میں سوائے متصوفانہ اسرار و معارف کے اور کچھ نہیں تو میں اپنی رائے اُن کے متعلق ظاہر کر چکا ، لیکن اگر انتخاب کنندہ نے غلطی سے انھیں ایسا سمجھ لیا ہے تو بیشک دیکھنے اور سمجھنے کی گنجایش باقی ہے ——— اس لئے آئیے ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لیں ———

اصغر کا کلام میں اس سے قبل بھی بارہا دیکھ چکا ہوں اور اُن کے بعض اشعار سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ اس لئے بغیر اس انتخاب کو دیکھے ہوئے بھی اُن کی شاعری کے متعلق رائے زنی کا مستحق اپنے آپ کو سمجھوں تو غلط نہ ہوگا ——— تاہم میں اس کو کسی اور صحبت پر ملتوی رکھتے ہوئے صرف اس مجموعہ پر تنقید کرنا چاہتا ہوں جو جامعہ ملیہ نے اس غرض سے میرے پاس بھیجا ہے

اس میں کلام نہیں کہ اصغر آجکل کے مبتذل گو شعراء سے بالکل علیحدہ رنگ رکھتے ہیں اور وہ ہمیشہ کوئی ایسی بات کہنا چاہتے ہیں۔ جو انسان کو غور و تامل کی طرف مایل کر دے۔ لیکن کہیں وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور کہیں نہیں بعض بعض اشعار میں وہ اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایسے الفاظ پا گئے ہیں جو ذہن سامع کو جلد کسی نتیجۂ صریح کی طرف لے آتے ہیں اور بعض میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی ، خواہ یہ ناکامی خود اپنے جذبہ کے نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ہوئی ہو یا مناسب الفاظ فراہم نہ ہو سکنے سے ۔ مثلاً اُن کا ایک شعر ہے :-

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخ آشیاں رکھدی

اس میں شاعر صرف اس جذبہ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ محبت کی اسیری پر دنیا کا ہر اطمینان و سکون قربان کر دینے کے قابل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس مفہوم کو انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے اور سننے والے کا ذہن بغیر کسی انتشار و خلش

اداؤں کا عاشق کے خونِ تمنا سے رنگین نظر آنا بالکل لکھنوی قسم کا شاعرانہ ادعا ہے۔ علاوہ اس کے دوسرا نقص یہ ہے کہ اگر دوسرے مصرعہ میں اس کا اشارہ داستان کی طرف ہو (اور یقیناً یہی ہے۔) تو داستان میں خونِ تمنا شامل ہونا کیا معنی ؟ ذکرِ خونِ تمنا ہونا چاہیے

ایک اور شعر ہے :-

کس قدر پُرکیف ہے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
اصلِ نغمہ ایک آوازِ شکستِ ساز ہے

پہلے مصرعہ میں جو دعوے کیا گیا ہے اس کا ثبوت دوسرے مصرعہ میں مفقود ہے۔ تاوقتیکہ شکستِ ساز کی آواز کو اصل نغمہ نہ ثابت کر دیا جائے، ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کو پُرکیف نہیں کہہ سکتے ——— اور اگر دوسرے مصرعہ کا ثبوت پہلے مصرعہ میں ہے تو ان کی ترتیب بدلنی چاہیے تھی

الغرض اس قسم کی غلطیاں جابجا اصغر کے کلام میں پائی جاتی ہیں، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ اُن کے شاعر ہونے سے انکار کر دیا جائے۔ بعض بعض شعر وہ قیامت کے کہہ گئے ہیں مثلاً

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
وہ ربطِ خاص رنجشِ بیجا کہیں جسے

میرے فغانِ رد پہ اس سروِ ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

مگر کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

مگر چونکہ انتخاب کنندہ کا معیارِ انتخاب، صحیح رنگِ تغزل سے ہٹا ہوا ہے اسلئے اس مجموعہ میں ایسے اشعار کم ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ خدمت کسی ایسے کے سپرد کی جاتی جو تصوف و حکمت اور اسرار و معارف کا دلدادہ تو نہ ہوتا۔ لیکن محبت کرنا جانتا اور محبت کی کیفیتیں اس پہ گزری ہوتیں۔ یہ مجموعہ سہر میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

(ماہ آیندہ ہم جگر کے سو شعر پر اظہار رائے کریں گے) ———

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب سید عبدالحکیم صاحب - گجرات)

میں بہت ابتدا سے رسالہ نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اُن تمام تغیرات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں، جو آہستہ آہستہ آپ کے مذہبی خیالات میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہر چند ایک قسم کی آزادی تو آپ میں شروع ہی سے پائی جاتی ہے لیکن اب زیادہ شدت ہو گئی ہے، جس کا سبب میں معلوم کرنا چاہتا ہوں

(نگار) آپ کے مراسلہ کو اصولاً باب الاستفسار میں جگہ پانا چاہئے، لیکن صرف اس خیال سے کہ اس کا تعلق زیادہ تر میری ذات سے ہے۔ اور جواب میں کسی خاص علمی یا ادبی مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں، باب المراسلہ میں درج کرتا ہوں

آپ کا یہ خیال یا نتیجۂ مطالعہ بالکل صحیح ہے کہ میرے مذہبی خیالات میں رفتہ رفتہ تغیر پیدا ہوا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اب اس تغیر نے ایسی کھلی ہوئی علیحدہ صورت اختیار کر لی ہے کہ بعض حضرات اس کو کفر و ارتداد سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ لیکن آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ ابتدا اجراء نگار سے تا ایندم کبھی ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اپنے خیال کے مطابق حق و صداقت سے دیدۂ و دانستہ اِبا کیا ہو یا میری نیت خدمتِ اسلام کے علاوہ کچھ اور رہی ہو ——— البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ پہلے میں اسلام کے مفہوم کو زیادہ محدود سمجھتا تھا۔ اور قدرے متعصب تھا، لیکن اب اس کو زیادہ وسیع سمجھتا ہوں اور کیش و مسلک کے امتیاز سے گزر گیا ہوں

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ رہ مابود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

اس میں شک نہیں کہ میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور نہایت سخت مذہبی ماحول میں میری تعلیم و تربیت ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کافی زمانہ اسی تقشف و تعصب میں بسر ہوا جس پر آج بھی ہر مولوی

کے از خود اس نتیجہ تک پہونچ جاتا ہے - لیکن برخلاف اس کے اسی غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو :-

(مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برق آشیاں رکھدی)

اس شعر کے سننے کے بعد ایک شخص یہ تو جان لیتا ہے کہ اس میں بلبل - گلہائے رنگیں - برق آشیاں تین لفظ ایسے جمع کر دیے گئے ہیں - جن کا باہمی شاعرانہ تعلق مخفی نہیں، لیکن شاعر کا مقصود کیا ہے ؟ اس کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا ـــــ اس شعر میں سب سے زیادہ ابہام جس سے پیدا ہوا ہے وہ " مٹی جاتی تھی " کے الفاظ ہیں ـــــ ہر شخص ان الفاظ کو سننے کے بعد یہ سمجھے گا کہ شاعر نے یہ الفاظ کہکر گویا بلبل پر کوئی طعن کیا ہے - اور اس لئے اس شعر کا مفہوم کچھ اس طرح کا ہونا چاہئے کہ " اے بلبل تو بہت گلہائے رنگیں کے جلووں پر مٹی جاتی تھی ، لیکن دیکھ اس کا نتیجہ کیا ہوا " مگر پورے شعر کے بعد کوئی مفہوم اس قسم کا پیدا نہیں ہوتا ـــــ شاعر کا مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ " بلبل کے مٹنے اور فنا ہونے کے لئے تو گل رنگیں کے جلوے ہی کافی تھے ، برق آشیاں کی کیا ضرورت تھی " لیکن افسوس ہے کہ الفاظ مناسب نہیں ملے اور یہ مفہوم تشنہ رہ گیا - اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :-

یونہی مٹ جاتی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر"

تو مفہوم ادا ہو جاتا ـــــ گو گلہائے رنگیں کے پردوں میں برق آشیاں کا پایا جانا پھر بھی محتاج تفصیل رہ جاتا ایک دوسری غزل کا شعر ہے :-

مجھی سے بگڑے رہتے ہیں مجھی پر ہے عتاب اُن کا
ادائیں چھپ نہیں سکتیں نواز شہائے پنہاں کی

گو مضمون پامال ہے لیکن صحیح تغزل کا رنگ لئے ہوئے ہے - اور انداز بیان نے اچھوتا پن پیدا کر دیا ہے - مگر اسی غزل کا دوسرا شعر یہ ملاحظہ فرمائیے :-

نگاہِ یاس و آہ عاشقان و نالۂ بلبل :
معاذ اللہ کتنی صورتیں ہیں اُنکے پیکاں کی

بندش کی کمزوری اور الفاظ کی ناموزونی نے سارا لطف خاک میں ملا دیا ـــــ ہر چند اس شعر کا مفہوم اُلجھا ہوا نہیں ہے - لیکن تفسیر و تعبیر ناقص ہے ، پہلے مصرعہ میں تین چیزیں پیش کی گئی ہیں ـــــ نگاہِ یاس - آہِ عاشقاں - نالۂ بلبل ـــــ اوّل تو ہر ٹکڑے کے بعد حرفِ عطف کا اظہار ناگوار ہے خاص کر " آہِ عاشقاں " کے بعد کہ پڑھنے میں آہ عاشقاں ادا ہوتا ہے جو مصرعہ کو فصاحت سے گرا دیتا ہے - علاوہ اس کے تینوں ٹکڑے برابر کے نہیں ہیں - کیونکہ یاس ایک کیفیت کا نام ہے جو بالکل غیر مادی چیز ہے - اور عاشق و بلبل دو مجسم و مادی چیزیں ہیں ، علاوہ اس کے عاشق کے ذکر کے بعد

بُلبُل کا ذکر کرنا۔ کوئی خاص مفہوم نہیں رکھتا کیونکہ عاشق کے تحت میں وہ بھی آجاتی ہے اور اگر بلبل کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ عشق کی کارفرمائی انسان وحیوان دونوں پر ظاہر ہو جائے تو پھر نگاہِ یاس کا ٹکڑا علیٰحدہ ہو جاتا ہے۔ اگر پہلا مصرعہ بدل کر شعر یوں ہو جاتا :۔

نگاہِ یاس، دردِ نامرادی، رنجِ محرومی
معاذ اللہ کتنی صورتیں ہیں اُنکے پیکاں کی

تو حروفِ عطف کا عیب بھی نکل جاتا اور تینوں ٹکڑے بھی محض " کیفیت " سے متعلق ہو کر برابر کے ہو جاتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس صورت میں حقیقتاً تینوں چیز ایک ہی قرار پاتی ہیں تو یہی اعتراض اُس مصرعہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نگاہِ یاس اور آہ و نالہ بھی فی الحقیقت ایک ہی کیفیت کی مختلف صورتیں ہیں

بعض اشعار میں صرف ایک ایک لفظ نے تعبیر کو ناقص کر دیا ہے مثلاً

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آگیا
اِن گلوں کو چھیڑ کر ہمنے گلستاں کر دیا

دوسرے مصرعہ میں یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ گلوں کو گلستاں کر دیا یعنی ان کی رنگینی کو اتنا بڑھا دیا کہ پھُول گلستاں ہو کر رہ گئے، لیکن پہلے مصرعہ میں اس فراوانی کو " رنگ سا کچھ آگیا " سے ظاہر کیا گیا ہے جو بجائے فراوانی کے " قلت " کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :۔

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ ہی رنگ آگیا
عارضِ نازک پر اُن کے رنگ سا رنگ آگیا!

تو عیب دور ہو جاتا

ایک اور شعر میں اسی طرح کی فروگزاشت پائی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشمِ مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھتے

دوسرے مصرعہ میں " ہلکا سا " لکھا گیا ہے جسکی رعایت پہلے مصرعہ میں موجود نہیں۔ اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :۔

بکھری ہوئی سی زلف بھی ہو چشمِ مست پر

تو ہلکے سے ابر کا مقابلہ ٹھیک ہو جاتا ——— بعض بعض شعروں میں ہلکی سی جھلک لکھنوی رنگ کی بھی پائی جاتی ہے مثلاً

داستاں اُن کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

بابُ الاستفسار

(جناب محمد عبداللہ خاں صاحب۔ کراچی)

بیدل کے چند اشعار

تکلیف تو ہوگی لیکن براہِ کرم بیدل کے حسب ذیل اشعار کا مطلب واضح طور پر بیان فرما دیجئے، چونکہ آپ نے اکثر و بیشتر بیدل کا ذکر کیا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے بہتر اس خدمت کو کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔ وہ اشعار یہ ہیں :——

به کدام فرصت ازیں چمن ہوس از فضولی اثر کشد شبِ خوں بعمر خضر زنم کہ نفس شراب سحر زند

شکست زاں چشمِ فتنہ مائل غبارِ امکاں بالِ بسمل مباش زافسونِ سُرمہ غافل ہنوز دستے ست در نگش

به کدام آئینہ مائلی کہ ز فرصت اینہمہ غافلی تو نگاہِ دیدۂ بسملی مژہ واکن و بہ کفن در آ

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمارِ ما چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنارِ ما

(نگار) میں بیدل کا شمار اُن شعراء میں کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان کے کلام مفہوم سمجھنے سے عاری ہو تو اُسے سمجھانے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ شعر کا لُطف صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب بغیر وساطت توضیح و تفسیر کے وجدانی طور پر ذہن نشین ہو جائے —— پھر چونکہ ہر شخص کا ذوق ایک مخصوص دائرہ کے اندر کام کرتا ہے،

اس لئے جب اس دائرہ سے ہٹ کر کوئی چیز اس کے سامنے آتی ہے تو اس کا ذہن مشوش ہو جاتا ہے اور اگر کسی کے سمجھانے سے مفہوم سمجھ میں آ بھی گیا تو وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو از خود سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے

بیدل کو شاعر کہا جائے یا نہ کہا جائے، مجھے تو اس میں بھی تامل ہے کیونکہ اس کی تخئیل اس درجہ نازک ہے کہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والے بھی بعض اوقات اس کی نزاکت تک نہیں پہونچ سکتے

بیدل ایک مجذوب ہے شاعر نہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے شاعری کے نقطۂ نظر سے دیکھنا غلطی ہے بلکہ ایک رند ژولیدہ مُو، ایک سر بصحرا زدہ جنوں کی حیثیت سے اس کے آواز کو سننا چاہیئے

جو اشعار آپ نے لکھے ہیں میں اپنی فہم و فراست کے مطابق اُن کا مفہوم تو بیان کئے دیتا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ وہ لُطف جو بغیر تفصیل و تشریح کے یوں..... حاصل ہونا چاہیئے وہ آپ کو حاصل نہ ہوگا۔ میں یہاں صرف مفہوم ظاہر کر دوں گا تعبیرات شاعرانہ کو آپ اس کے مطابق کر لیجئے گا

(۱) پہلے شعر میں اس کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کارگاہ عالم میں انسانی تگ و دو کی ہوس رانی حد درجہ حماقت ہے کیونکہ انسان تو یہاں کوئی فرصت لے کر آیا ہی نہیں اور بڑی سی بڑی فرصت و مہلت بھی حد درجہ مختصر ہے

پہلا مصرعہ :-

اتنی فرصت کہاں کہ اس چمن یا دنیا میں ہماری ہوس کوئی نتیجہ پیدا کر سکے

دوسرا مصرعہ :-

کیونکہ اس تنگی فرصت کا یہ عالم ہے کہ عمر خضر مل جائے تو بھی وہ اس سے زیادہ کام نہیں دے سکتی کہ بہ مشکل ہم شام کو سحر کر سکیں

(۲) محبوب کی چشم فتنہ پرداز کا یہ اثر ہے کہ بالِ بسمل سے غبارِ امکان لوٹ گیا یعنی بسمل تڑپ کر مر گیا۔ اس لئے اس وقت سے غافل نہ ہو جب اُن آنکھوں میں سُرمہ بھی لگ جائے کہ اس وقت تو خدا جانے وہ اور کیا قیامت ڈھائیں گی سُرمہ کے متعلق یہ کہنا کہ " ہنوز دستے ست تا زیر سنگش " صرف اس لحاظ سے ہے کہ طیار ہونے سے قبل وہ کھرل میں پیسا جاتا ہے

(۳) تو کس تماشہ میں مصروف ہے، کس آئینہ کے سامنے اپنی زیبائش و آرائش میں لگا ہوا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی فرصت تجھے ملی ہے وہ دیدۂ بسمل کی آخری نگاہ سے زاید نہیں اس لئے آنکھ کھول اور کفن کے اندر آ جا کہ تیری فرصت کا اقتضاء اس سے زاید نہیں

(۴) یہ شعر صاف ہے۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ عاشق کی تمنائیں وصل محبوب کے باب میں اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ کبھی پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر وہ محبوب سے کہتا ہے کہ " ایک عمر گزر گئی تیرے

فخر کرسکتا ہے، لیکن اب اس کو عقل وضمیر کی رہنمائی کہئے یا طاغوتی کارفرمائی کہ مذاہب عالم کی تاریخ، حکومتوں کی داستان فتح وظفر، اور اسی کے ساتھ طبیعیات وفلکیات کے مطالعہ نے ایک عجیب انقلاب ذہن میں پیدا کیا۔ اور سب سے پہلا حجاب دُور ہونے کے بعد جو منزل سامنے آئی وہ "ماعرفناک حق معرفتک" کی تھی

پہلے میں یقین رکھتا تھا کہ خدا ایک مستبد و جبار ہستی ہے جو سوائے مسلمانوں کے کسی اور کو نجات دینے والی نہیں، وہ ہمارے دنیاوی سلاطین ہی کی طرح ایک فرمانی قوت ہے جو سزا وعطا کے لحاظ سے مسئول نہیں ہوسکتی اور جو ہماری عبادت سے (بشرطیکہ آنکہ اسلامی طریقہ سے ادا کی جائے) خوش ہوتی ہے اور ترکِ عبادت سے برہم ——— لیکن جوں جوں کائنات کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا، علم وعقل کی فرمانیاں واضح ہونے لگیں اور مسلمانوں کی اس تنگ ذہنیت کو رفتہ رفتہ میں خدا کی توہین سمجھنے لگا۔ یقیناً دیگر مذاہب بھی اس عصبیت میں مبتلا ہیں لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم ازکم اسلام کو میں اس داغ سے پاک دیکھنا چاہتا تھا۔ اور آخر کار اس احساس کی شدت نے میرے ضمیر اور میرے علم ویقین کو جس اقدام کی طرف مجبور کیا وہ یہ تھا کہ

بیا کہ روئے بہ محراب گاہ نور نہیم بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم
حطیم کعبہ شکست و اساسِ قبلہ بریخت بتازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم

پھر یہ "کعبۂ دیگر" کیا تھا۔ یہ "قصرِ بیقصور" کیا ہوسکتا تھا، ؟ یہی تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑنا، تفریقات شعائر ورسوم کی خلیج کو پُر کردینا اور ایک ایسی بلند چوٹی پر اسلام کا جھنڈا نصب کرنا جس سے زیادہ رفعت کسی اور مذہب کے پرچم کو میسر نہ آسکے ——— پھر چونکہ میں اسلام کو اس کی حقیقت کے لحاظ سے اخلاق کی دنیا میں ایک آخری آواز سمجھتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ اسلام نام مخصوص وضع وشکل بنانے کا نہیں ہے، چند متعین حرکات کی پابندی کا نہیں ہے بلکہ وہ مسمّٰی ہے ارتقاءِ نوعِ انسانی کا، عروج فضل وکمال کا، اور اخلاق کی انتہائی رفعت کا اس لئے میں مجبور تھا کہ موجودہ مرعوبات مذہبی اور مفروضات دینی کی تنگ وتاریک فضا سے بلند ہوکر کوئی نصب العین ڈھونڈھتا۔ اور شکر ہے کہ میری عقل نے اس باب میں میری رہبری کی اور جوں جوں حجابات دُور ہوتے گئے۔ میری آواز میں بلندی ، میرے عزائم میں سختی اور میرے مسلک میں وسعت پیدا ہوتی گئی، حتےٰ کہ آج خدا میری نزدیک نام ہے ایک ایسی قوت غیر متاثرہ کا جو کافر ومسلمان کی بے معنی اصطلاحوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، جو مسجد وکلیسہ، کاشی وکعبہ، اذان وناقوس، طواف اور پیکراں سب سے بے نیاز ہے۔ اور وہ انعام وانتقام، جزا وسزا کو کبھی کسی سے اسلئے متعلق نہیں کرتا کہ فلاں اُسے۔ اللہ کے نام سے پکارتا ہے اور فلاں رام کے نام سے، یا وہ مندر میں گھنٹہ بجاکر اس کی یاد کرتا ہے یا یہ کان میں اونگلی دے کر اذان کی آواز سے اُسے پکارتا ہے ——— وہ اگر خدا ہے تو سب کا خدا ہے۔ اور اس نے ہر شخص کی جزا وسزا، ہر قوم کی دوزخ وجنت خود اسی شخص یا قوم کے اندر پنہاں رکھدی ہے خواہ

وہ اِسے اختیار کرے یا اُسے

پھر جو شخص تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانا چاہتا ہو اور جو صرف صحتِ اخلاق کو غرض مشترک قرار دے کر دُنیا سے عصبیت کو مٹا دینا پسند کرتا ہو، اس کے خیالات وعقاید میں اگر آپ یہ تغیر محسوس کریں تو جائے عجب نہیں اور پھر یہ منزل تو ابھی صرف قیل وقال اور حجت واستدلال کی ہے، کسے خبر ہے کہ کل اگر میں اس منزل سے بھی گزر کر صرف خاموش عمل کی منزل میں آگیا تو میرے منہ سے کیا نکلے گا، اور آج جو صرف کافر ومرتد کہکر مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ کل مجھے دیوانہ ومجنوں جان کر پتھر نہ ماریں گے

اجد الملامۃ فی ھواک لذیذۃ
حبا الذکرک فلیلمنی اللوم

شہوانیات یا ترغیباتِ جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جسمیں فحاشی کی تمام فطری وغیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ ونفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ **نگار کے خریدار** ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۴ر میں اور غیر مجلد ۳ر میں ملے گی اور اگر آپ **نگار کے خریدار** نہیں ہیں تو مجلد ۵ر میں غیر مجلد ۴ر میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی۔پی روانہ کی جائے۔ حجم ۳۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد وغیر مجلد کی صراحت ضروری ہے ——

منیجر نگار لکھنؤ

ساتھ بادہ خواری میں مصروف ہوں۔ لیکن خمارِ محرومی اب تک نہیں گیا، خدا کے لئے بتایئے کیا قیامت ہے کہ باوجود پہلو سے مستقل رہنے کے بھی میرے پہلو سے جُدا ہے، باوجود آغوش میں رہنے کے آغوش سے علیٰحدہ ہے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

جمالستان

نگارستان کا دوسرا حصّہ حجم ۸۰ صفحات

قیمت فی کاپی مجلد للعہ ——— غیر مجلد للعہ ——— علاوہ محصول

خریداران نگار سے ——— ایک روپیہ کی رعایت

فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے:-

دنیا کا اوّلین بُت ساز
ایک شاعر کی محبت
شہید آزادی
دو خط
سودائے خام
۲۵ء کا ایک صوفی
زہرہ کا ایک پجاری
مطربۂ فلک

فریبِ خیال
میر بیدانہ
بعد المشرقین
جانعالم اور ملکہ مہر نگار
درسِ محبت
ایک شاعر کا انجام
رادھا
چنگاری

صدائے شکست
تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل
ولے بخیر گزشت
چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ
ازدواج مکرر
آدم وحوا سے پہلے
سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام
محلہ کی رونق

دو گھنٹے جہنم میں
ایثار
ٹیلی فون نمبر ۶۷
شبنمستان کا قطرۂ گوہریں
انتظام علی صاحب
شہزادۂ خرم اور ابابیل
نوجوان شہزادہ
داستان حُسن وعشق کا ورق خونیں

منیجر نگار لکھنؤ

کسان

دے نہ گر درسِ تپش، خورشید کی تابندگی ظلمتوں میں ڈوب کر رہ جائے نبضِ زندگی
گر نہ ہو محوِ تبسم، ماہِ تاباں کا جمال نرم رَو موجوں کو حاصل ہو نہ طوفاں کا جلال
گر نہ گرمِ سیر ہو، صحنِ گلستاں میں نسیم حشر تک سوتی رہے غنچے کے سینے میں شمیم
گر ہَوا میں ابرِ تر قطروں کا پھیلائے نہ جال ہو نہ دُنیا میں پرافشاں طائرِ حُسن و جمال

یوں ہی گرد ہقاں رہے سعی و عمل سے بیخبر
زندگی کی موج رقصاں ہو نہ سطحِ خاک پر

کس قدر اس بے نوا، دہقاں کی سیرت ہے عجیب خود مریضِ مضطرب اور دردِ عالم کا طبیب
اس کے عالم میں نہیں جنگِ یقین و احتمال خال و خد سے ہے عیاں صدیوں کی محنت کا جلال
کوہ کے مانند ہے اس کے ارادوں کا ثبات ہے اسی کے دوش پر صدیوں سے بارِ کائنات
مطمئن اپنی روش پر، محوِ آئینِ قدیم اس کے سینے میں نہیں ہنگامۂ اُمید و بیم
بیل ہے، یہ ہے، زمیں ہے، اور خیالِ فصل و کشت جھونپڑا ہے قصر اس کا، کھیت ہے اسکی بہشت
آگ برسے چرخ سے، رُک جائے یا نبضِ حیات اس کی دنیا میں نہیں پروائے سیلِ حادثات
کھیل ہے اس کے لئے ہر شورشِ ہمت شکن شیر کا انداز، طوفاں کی طرح، ہیبت فگن
بازوؤں میں آندھیوں کا زور، لوہے کا جگر حوصلہ بیباک، دل بے خوف، بے پروا نظر

زندگی کا راز دنیا کو بتا دیتا ہے یہ
محنتِ صبر آزما پر مسکرا دیتا ہے یہ

ہے مگر اس کاوشِ سعی و عمل کا یہ مآل — اس سے بڑھ کر کون ہوگا، بدنصیب و خستہ حال
باوجودِ ہمتِ آزاد و عزمِ اُستوار — اس سے بڑھکر کون ہوگا، دردمند دلفگار

. . . . . .

قصرِ دولت کی ستم رانی سے تھرّایا ہوا — زخم دار بے کسی، دنیا کا ٹھکرایا ہوا
اس کی نظروں میں نہیں تہذیب و دانش کا جلال — اس کی آنکھوں سے نہاں ہے عشرتِ بزمِ جمال
اس قدر ناآشنا، یعنی سمجھتا ہی نہیں — اس کے دل میں زندگانی کی تمنا ہی نہیں
یہ رہینِ صد محن کیا جانے کیا ہے زندگی — شام کا حسنِ لطافت، صبح کی تابندگی
روح کو کیونکر جگا دیتا ہے اِک رنگیں گلاب — کس طرح نغموں سے چونک اٹھتا ہے احساسِ شباب

زندگی کا راز حسن و نغمہ و صہبا میں ہے
فصل و بارش کے سوا کچھ اور بھی دُنیا میں ہے

ہے اس احساسِ الم پرور کا آخر کیا سبب؟ — کس نے اسکی روح کو رکھا ہے پابندِ تعب؟
کیوں ہے یہ ابتک رہینِ جستجوئے ناتمام؟ — کس نے اس کی سیر گاہوں میں بچھا رکھے ہیں دام؟
کون اس کی فکر کو دیتا ہے درسِ نارسی؟ — کس کے اطمینان کا ساماں ہے اسکی بے کسی؟
اس کی ناپرسی ہے کس کی خودسری کا مدعا؟ — کیوں سرورِ نور سے محروم ہے اس کی فضا؟
چھیڑتا ہے ذرہ ذرہ گو سرودِ مہر و ماہ؟ — بن گئی ہے اسکی ہستی کیوں سراپا اشک و آہ؟
غرقِ آسائش ہے دنیا کی بہشتِ مختصر — یہ مگر ان سرمدی جلووں سے ہے کیوں بے خبر؟

کس نے اس ظلم فراواں کا کیا ہے بند و بست؟
دے رہا ہے کون اس کے عزم کو پیہم شکست؟

کیا یہ ممکن ہے، کہ ہو یہ مرضیٔ پروردگار — کیونکہ اُس کے حکم پر ہے زندگانی کا مدار
جس کی صناعی نے کی تشکیلِ ماہ و آفتاب — اِک پئے فکر و عمل اور ایک بہرِ درسِ خواب

راستے پیدا کئے اِن کے گزرنے کے لئے اپنے اپنے محوروں پر رقص کرنے کے لئے
عقلِ انسانی پہ کھولے جس نے اسرارِ حیات مختلف جلووں سے کی معمور بزمِ کائنات
جس نے کی اِس خاک کی چٹکی کو وہ رفعت عطا کھل گئی اس کی نگاہوں پر ستاروں کی فضا
جس نے اس مجبور کو بخشا وہ عزمِ فتحمند بڑھ گئی اوجِ فلک سے اس کی پروازِ بلند

نسلِ انسانی پہ اتنا ظلم ایسا قتلِ عام
حیف ہے گر ہو یہ دُنیا کے خدا کا اہتمام!

اس سے بڑھکر کوئی صورت اور کیا ہوگی مہیب نوعِ انسانی کی تخریب و تباہی کی نقیب
اس سے بڑھکر اور کیا دردآفریں ہوگی فغاں جس کے سننے پر ہو قادر گوشِ ابنائے زماں
اور کیا ہوگا بپا ہنگامۂ روزِ مصاف ظلم و حرص و آز کی سفاک دُنیا کے خلاف
اور کیا ہوگی حیاتِ نوعِ انسانی تباہ اور کیا دیکھے گی دُنیا ظلمتِ روزِ سیاہ

لطفِ پیہم کے ارادوں سے گزر سکتا نہیں
خالقِ ارض و سما یہ ظلم کر سکتا نہیں

ہل چکی ایوانِ دولت کی بنائے استوار ہوشیار اب اے خداوندانِ گیتی ہوشیار
ناز ہے جس پر تمھیں ہے یہ وہی جنسِ گراں بیکسوں کے اشک، مزدوروں کی آہِ ناتواں!
یوں ہی ہوتا ہے، سپاسِ منتِ یزدانِ پاک سرمدی جلووں سے کی معمور جس نے سطحِ خاک
خواہشوں کی رَو میں اتنا جبر، یہ قہر و عذاب کیا یہی ہے بے شمار اکرامِ فطرت کا جواب
آندھیوں میں ظلم کی پہنائے گیتی ہے تباہ ظلم ایسا، جس کی بے اندازہ صدیاں ہیں گواہ

کر رہا ہے برق کی تعمیر فطرت کا جلال
یہ بتاؤ تم نے سوچا ہے کبھی اس کا مآل

ہاں یہی دہقاں، یہی بیگانۂ علم و شعور جس کو ٹھکرا کر تمھیں ملتی ہے تسکینِ غرور

جس کی محرومی سے پاتی ہے خداوندی غذا
جس کی بربادی سے ہے بزمِ طرب کا اہتمام
جس سے چھینا تم نے احساسِ حیاتِ کامگار
محرمِ انوارِ آسایش نہیں جس کی جبیں
جو حزیں ابتک اسیرِ ہستیِ موہوم ہے
کچھ خبر ہے رنگِ ہستی کیا سے کیا ہو جائے گا
جب بغاوت کی اٹھیں گی حشر پرور آندھیاں
ہوش میں آئیگا جب مدت کی مدہوشی کے بعد
کون روکے گا وہ جوشِ قہر و طوفانِ عتاب
کس کے بازو میں ہے یہ طاقت کہ روکے اسکے وار
ٹھوکریں کھاتی پھرے گی سطوتِ جاہ و جلال
عظمتوں کا قصر آنسو کی طرح بہ جائے گا
صبح اُن کے حق میں ہوگی نوحۂ و ماتم کی شب
چاہتے ہو گر کہ دُنیا ہو نہ برباد و زبوں
اس سے پہلے جبکہ یہ اس خواب سے بیدار ہو
جبکہ اس کے دل میں ہو بیچین جوشِ انتقام

جس کے دل پر ہے تمھارے قصرِ نخوت کی بِنا
خون سے جس کے درخشاں ہیں تمھارے صبح و شام
عشرتوں کا ناز، عقل و علم و دانش کا وقار
جس کو آزادی سے جینے کا بھی حق حاصل نہیں
جس کی دنیا سرمدی انوار سے محروم ہے
جب دماغ اس کا حقیقت آشنا ہو جائیگا
جب یہ لے گا اِس جہاں کے حوصلے کا امتحاں
جب زباں کھولے گا یہ صدیوں کی خاموشی کے بعد
کون دے گا اس کے پُر ہیبت سوالوں کا جواب
کس کی ہمت کو یہ قدرت ہے کہ ہو اس سے دوچار
موجِ ظلمت بن کے رہ جائیں گے اجزائے جمال
دولتوں کا ناز اپنے حال پر شرمائے گا
زندگی کا حق جنھوں نے اس سے چھینا بے سبب
انتقام اس کا نہ ہو غارت گرِ امن و سکوں
اور اس کے قہر کی تلوار، آتشبار ہو
اور لہو پی پی کے ہو دیوِ بغاوت شادکام

تمکو اس کی فکر "استعمار" کرنا چاہیئے
اور اپنے جرم کا اقرار کرنا چاہیئے

علی اختر (حیدرآباد دکن)

معلومات

بعض محیر العقول تماشوں کی حقیقت

آج کل بعض فقرار ایسے دہشت ناک تماشے دکھاتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے درانحالیکہ حقیقتاً وہ کچھ نہیں ہوتے۔ مثلاً نوکدار کیلوں، ننگی تلواروں پر لیٹ جانا۔ سینہ پر پتھر رکھوا کر توڑوانا، کانچ کے ٹکڑوں پر برہنہ چلنا، ننگے بدن آگ سے گزر جانا، منہ میں انگارہ لے لینا، گھنٹوں تک زمین میں دفن رہنا۔ یہ تمام باتیں بہت معمولی ہیں اور ان میں کوئی معجزہ و کرامت نہیں ہے

مثالاً نوکدار کیلوں پر لیٹنے کی حقیقت کو ملاحظہ کیجئے کہ ہر شخص بغیر کسی مشق کے کر سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کا ثقل تمام کیلوں پر تقسیم ہو جاتا ہے اور جتنا وزن ایک کیل کے اندر پیوست ہونے کے لئے ضروری ہے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ عام طور پر وہ تختہ جس پر لوگ لیٹتے ہیں کم از کم ۵-۶ ہزار کیلیں رکھتا ہے اور جس وقت انسان کے وزن کو ان کیلوں پر تقسیم کیا جائے گا تو مشکل سے ۱۰ رتی فی کیل کا اوسط پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اتنے وزن سے ایک کیل جسم کے اندر پیوست نہیں ہو سکتی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ دو تلواروں پر لیٹ کر سو جاتے ہیں اور ان کے سینے پر پتھر رکھ کر توڑا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے جسم و اعصاب کو سخت کر کے لیٹ جاتا ہے اور لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اس پر مسمریزم کا عمل کیا گیا۔ پھر دو تلواریں دو آہنی ڈھانچوں پر رکھ کر اُسے تلواروں پر لٹا دیتے ہیں۔ جو تیز نہیں ہوتیں۔ اس کے بعد سینہ پر پتھر رکھ کر توڑتے ہیں۔ اس کا راز صرف یہ ہے کہ جسم کے اُس حصہ کے نیچے جہاں پتھر رکھا جاتا ہے خلا ہوتا ہے اور اس لئے جب ضرب لگائی جاتی ہے تو اس کا اثر صرف اُن آہنی ڈھانچوں پر پڑتا ہے۔ جن پر تلواریں رکھی ہوئی ہیں اور جسم متاثر نہیں ہوتا۔ اس کا تجربہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ پتھر کا کوئی ٹکڑا آپ ہاتھ میں لیں اور اُسے ہتوڑی سے توڑیں تو پتھر ٹوٹ جائے گا۔ اور ہاتھ میں ضرب نہ آئے گی، لیکن اگر آپ کا ہاتھ زمین پر ہوگا تو مجروح ہو جائے گا

کانچ کے ٹکڑوں پر چلنے کی حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ ٹکڑے تیز نوکدار نہیں ہوتے اور اُن کی دھار کُند پتھر سے ماردی جاتی ہے ——— آگ پر چلنے یا آگ منہ میں رکھ لینے کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے پھٹکری کا پانی اور گندھک کا تیزاب ملا کر

جسم پر مل لیتے ہیں اس سے یہ ہوتا ہے کہ آگ کا اثر فوراً نہیں ہوتا اور ایک شخص تیزی سے آگ پر دوڑ سکتا ہے

زندہ دفن ہو جانے کی اصلیت یہ ہے کہ جس تابوت میں لٹا کر دفن کرتے ہیں وہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کی آکسیجن ۶۔۷ گھنٹہ تک انسان کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ احتیاطاً اس کے منہ، ناک اور کان پر روئی رکھ دیتے ہیں تاکہ تنفس آہستہ آہستہ ہو اور آکسیجن کی موجودہ مقدار زیادہ دیر تک کام دے سکے

لاشوں کا تبادلہ

جرمنی کی ایک ضعیف عورت ڈرسڈین سے وینا سفر کر رہی تھی۔ جب ریل زیکوسلوویکیا کے حدود میں پہونچی تو وہ بیمار ہوگئی اور وہیں کسی شفاخانہ میں داخل کر دی گئی۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ مرگئی تو اس کے خاندان والوں کو ذریعۂ تار اس کے مرنے کی اطلاع دیدی گئی۔ جب چار دن کے بعد اس کا تابوت جرمنی میں پہونچا۔ اور اُسے کھولا گیا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ تابوت، کے اندر بجائے ضعیف عورت کے ایک اطالوی فوجی افسر کی لاش وردی کے ساتھ نظر آئی

یہاں سے فوراً تار بھیجا گیا کہ "تابوت میں اطالوی افسر کی لاش ملی ہے۔ بڑھیا کی لاش کہاں گئی" وہاں سے جواب آیا۔ "اس غلطی پر سخت افسوس ہے۔" بڑھیا کی لاش بولون چلی گئی"۔ لوگوں نے بولون تار دیا۔ وہاں سے یہ جواب ملا کہ "یہاں تو وہ لاش دفن کر دی گئی۔ اور تمام انھیں فوجی مراسم اعزاز کے ساتھ جو ایک افسر کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ اور قبر پر فوجی نشان وغیرہ بھی نصب کر دیے گئے۔ اس لئے ہمارے فوجی افسر کو بڑھیا سمجھ کر وہیں دفن کر دیجئے"

بولون میں آج بھی بڑھیا کی قبر موجود ہے اور جب فوج اُس طرف سے گزرتی ہے تو اسی طرح سلامی دیتی ہے جیسے کسی فوجی افسر کی قبر کے سامنے دی جاتی ہے

حسن و ذکاوت کی جنگ

ذہانت و جمال کے درمیان ایک زمانہ سے جنگ جاری ہے۔ بعض لوگ حسین عورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی غبی کیوں نہ ہو۔ اور بعض اس کے برخلاف صرف ذہانت و ذکاوت کو پسند کرتے ہیں

شکاگو کی یونیورسٹی (دی بول) کا معمول ہے کہ وہ ہر سال اپنی رپورٹ کے ساتھ جمیل ترین طالبات کی تصویریں بھی شایع کرتی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جو رپورٹ شایع ہوئی وہ اس قاعدہ کے خلاف تھی۔ یعنی اس میں بجائے جمیل طالبات کے ذہین لڑکیوں کی تصویریں شایع کی گئیں۔ اس پر وہاں کے طلبہ میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ اور اس اختلاف نے اس حد تک طوالت اختیار کی کہ آخر کار یہ تجویز قرار پائی کہ آیندہ سے پانچ حسین لڑکیوں کی اور پانچ ذہین طالبات کی تصویریں دی جائیں

تخفیف اسلحہ کی حقیقت

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد تمام ممالک کا رُجحان اس طرف ہے کہ اسلحہ کو کم کیا جائے اور سامانِ حرب کو رفتہ رفتہ مفقود کر دیا جائے کہ دُنیا کا آیندہ امن و سکون

اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس امر پر تمام حکومتوں نے اتفاق کر کے باہمی معاہدہ بھی کر لیا۔ لیکن اس عہد و پیماں کا عملی نتیجہ کیا ہوا۔ وہ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا :۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۱ء کے آخیر تک ——— برطانیہ نے ۲۳۷۰۰۰۰۰ گنی آلات حرب پر صرف کیں،
فرانس نے جنگی جہازوں کی طیاری میں ۵۰۰۰۰۰۰۰ گنی صرف کیں
اطالیہ نے فوجی طیاریوں میں ۱۲۵۰۰۰۰۰ گنی خرچ کیں
امریکہ نے ۳۶۰۰۰۰۰۰ گنی اور جاپان نے ۱۱۰۰۰۰۰۰

برطانیہ کے تمام فوجی مصارف ۱۹۳۱ء میں وہی رہے جو ۱۹۱۴ء میں تھے، فرانس میں ۲۰۸۰۰۰۰۰ کا اضافہ ہوگیا۔ اور اطالیہ میں ۱۵۴۰۰۰۰۰ کا۔ اسی طرح امریکہ نے ۱۵۶۸۰۰۰۰ گنی زیادہ صرف کیں

دماغوں کا عجائب گھر

ویانا میں ایک شخص ڈاکٹر اکونومو ہے۔ اس نے ایک عجائب گھر صرف انسانی دماغوں کے لئے قائم کیا ہے۔ اور بڑے بڑے علماء، فیلسوف، شعراء، ادباء، اور سیاسی رہنماؤں کے دماغ شیشے کے ظرف میں نہایت اہتمام سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہر شیشہ پر وہ اس شخص کا نام، اور دماغ کا وزن وغیرہ بھی درج کر دیتا ہے۔ اس وقت تک کثیر تعداد میں اس نے "دماغ" جمع کر لئے ہیں اور دُنیا کے تمام مشاہیر سے وہ اس باب میں خط و کتابت کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کی بابت اس کو دے جانے کی وصیت کر جائیں

چھڑی کا استعمال

جرمنی کے ایک رسالہ نے نہایت بسیط بحث کی ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ اس نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اس کا بیان ہے کہ چھڑی لے کر انسان کا چلنا اس کی صحت کے لئے مُضر ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو اس کا استعمال نہیں کرتے عموماً زیادہ فراخ سینے، بھرے ہوئے بازو اور مضبوط ہاتھ رکھتے ہیں

اس کا خیال ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے عہدِ وحشت کی یادگار ہے جب اُسے سنگلاخ زمین پر کوہستانی صحراؤں میں چلنا پڑتا تھا اور سہارے کی ضرورت تھی۔ اب اس کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کا استعمال انسان کو سہارا لینے کا عادی بنا دیتا ہے جو اعضا کے نشو و نما کے منافی ہے

مجموعہ استفسار جواب۔ زیر کتابت ہے اور دو تین ماہ کے اندر شائع ہو جائے گا۔ اگر آپ چاہیں تو رعایت سے فائدہ اٹھانے کے لئے اب بھی ڈیڑھ روپیہ (عہ) بھیج سکتے ہیں ———

منیجر نگار لکھنؤ

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

گوڈر کا لال	للعہ	فرائض مادری	۱۲ر
شوکت آرا بیگم حصہ ۲ و ۳	ے	افسانہ نادر جہاں	عہ
" حصہ سوم	ے	اقبال دو بہنیں	عہ
سعیدہ کے خطوط	عہ	حسن معاشرت	عہ
پیاری سہیلی	۱۰ر	ایامی	عہ
نئی نویلی پیاری سہیلی	عہ	سولہ کہانیاں	۱۲ر
عورتوں کی انشاء	عہ	سترہ کہانیاں	۱۲ر
انشاء نسواں	۸ر	سولہ قصے	۸ر
سبزۃ الکبریٰ	عہ	مراۃ العروس	۸ر
طرز زندگی حصہ ۱ و ۲	عہ	نباۃ النشء	۸ر
تحذرات تیموریہ	عہ	توبۃ النصوح	۱۲ر
ازواج النبی	۱۲ر	کنیز فاطمہ	۸ر
ازواج الانبیا	عہ	پنکھڑیاں	۸ر
سبزۃ عائشہ صدیقہ	عہ	نصیحت کا کرنپھول	۸ر
عفت المسلمات	عہ	برکات سلطانی	۸ر
سبیل الجناں	عہ	ابن الوقت	عہ
بچوں کی پرورش	عہ	چند پند	۴ر
حرز اطفال	عہ	منتخب حکایات	۴ر
تہذیب نسواں	عہ	تندرستی	عہ
بیوی کی تعلیم	عہ	حفظ صحت	عہ
بیوی کی تربیت	عہ	طبیب نسواں	عہ
تربیت اطفال	۱۲ر	رہبر صحت	۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

قطرات اشک	عہ	موہنی	۱۲ر
جتندر ناتھ	عہ	وداع ظفر	عہ
بس کار دکھ	عہ	یاسمین شام	عہ
فسانۂ سعید	۸ر	طوفان اشک	عہ
خوفناک ڈکیتی	عہ	شاہین دوراج	۸ر
سیلاب اشک با تصویر	عہ	درس عشق	عہ
بے زبان دوست	۶ر	کروڑپتی چور	عہ
جمال ہم نشیں	عہ	بتیس بندوق باز	عہ
تفسیر عصمت	عہ	کرشمۂ رقابت	۸ر
جوہر قدامت	عہ	انقلاب قسطنطنیہ	۸ر
نائیلہ غیبی	۸ر	شاہد رعنا	عہ
پراسرار قتل	عہ	ویڈیا کی سرگزشت	۱۲ر
اعلان آزادی	۵ر	شگوفۂ محبت	۷ر
سرگزشت ہاجرہ	۱۰ر	نسوانی زندگی	۸ر
نوحہ زندگی	۱۲ر	ولایتی تتھی	۸ر
قلب حزیں	۸ر	شمع خاموش	۸ر
عروس کربلا	عہ	شب زندگی کامل	عہ
شہید مغرب	عہ	مودودہ	۸ر
ماہ عجم	عہ	چندر کلا	۸ر
تیغ کمال	عہ	گلستان خاتون	عہ
سراب مغرب	۸ر	صبح زندگی	عہ
منازل سائرہ کامل	عہ	شام زندگی	عہ

تاریخ و سوانحعمریاں

تاریخ مغرب	عہ	بازاری زبان	۸ر
مختصر تاریخ اسلامی	۸ر	لغات سعیدی	للعہ
" " حصہ ۲	۹ر	لغات کشوری	ے
" " حصہ ۳	۱۰ر	گنجینۂ تحقیق مجلد	للعہ
" " حصہ ۴	عہ	سبز اللغات فارسی	عہ
الصالحات	عہ	محاورات نسوان	۸ر
امت کی مائیں	عہ	جواہر اللغات	۱۲ر
الزہرا	۱۲ر	گوہر اللغات	۱۲ر
اسوۂ حسنہ	۸ر	چراغ سخن	عہ
ہندو شعراء	عہ	دکھنی لغت	۸ر
شونہار	عہ	جواہرات کلیات نظیر	عہ
سوانح اکبر الہ آبادی	عہ	عزیز اللغات	عہ
سفرنامہ عراق	عہ	تذکرۂ رنجی	عہ
تاریخ افاغنہ	عہ	تاریخ اردوے قدیم	عہ
اسلام اور غیر مسلم	۶ر	دکن میں اردو	عہ
سیر المصنفین حصہ ۱	عہ	منتخب کلام ہندی	عہ
" " حصہ ۲	ے	رباعیات عمر خیام	عہ
تاریخ اسلام ۵ جلد	صہ	منتخب کلام ہندی	عہ
اخبار الاندلس ۳ جلد	عہ	اردو کے سات جلد ان	عہ
خلافت موحدین	عہ	تصریح الاغلاط	۴ر
خلافت مولدین	عہ	مفیض اردو	۵ر
عرب در اسکا مستقبل	عہ	نور اللغات ۴ جلد	للعہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز	عہ	کلیات غالب	عہ
کلیات عرفی	۱۲ر	کلیات صائب	عہ
دیوان حافظ	عہ	دیوان ناصر علی	۷ر
دیوان بیدل	عہ	کلیات سعدی	عہ
دیوان عرفی	۱۲ر	کلیات حزیں	عہ
کلیات جامی	عہ	دیوان عنصری	۱۴ر
دیوان غنی کشمیری	۶ر	اسرار خودی و رموز بے	
دیوان ہلالی	۶ر	زبور عجم	بے
		پیام مشرق	بے
		قصائد عزیز مجلد	بے

دواوین اُردو

کلیات ظفر	عہ	کلیات نظیر اکبر آبادی	عہ
کلیات مومن	عہ	گلزار داغ	عہ
دیوان ناسخ	عہ	دیوان رند	۱۲ر
کلیات میر	عہ	دیوان ذوق	۱۲ر
کلیات سودا	عہ	گلکدہ عزیز	عہ
کلیات انشاء	عہ	مراۃ الغیب	عہ
		صنمخانۂ عشق	عہ
		فریاد داغ	عہ
		عالم خیال با تصویر	عہ
		دیوان شہیدی	۴ر
		کلیات اکبر الہ آبادی	للعہ
		نغمۂ دل شاہجہانپوری	عہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم ۸ر
- شب معراج عہ
- سراج منیر عہ
- پیغمبر عالم ۸ر
- سوانح حضرت رسول عہ
- سید المرسلین ۸ر
- حیدر کرار ۸ر
- سیرۃ الصدیق عا
- عمر ابن خطاب ۸ر
- ابوبکر صدیق عہ
- ائمہ اسلام ۱۲ر
- الحبیب عا
- عمر بن عبدالعزیز ۸ر
- دولت غار و قبہ عا
- مکمل سوانح زیب النساء بیگم عہ
- تذکرہ اولیا عا
- تذکرہ اولیائے ہند للعہ
- مراۃ الکونین عا
- قصص الانبیا مکمل ۱۲ر
- سفرنامہ چین عا
- تلخیص التواریخ عہ
- خاتون جنت ۸ر
- مختارات الصوفیہ عہ
- خواتین اگورہ عہ
- مشاہیر نسواں عہ
- مشاہیر ہند عا
- فقرات نجمودہ عا
- بیگمات بنگال ۶ر

جاسوسی کے ناول

- شرلاک ہولمز عا
- محاصرہ پیرس ۸ر
- شیخ چلی ۴ر
- بہرام کی واپسی ۴ر
- انقلاب فرانس عہ
- بحری قزاق عہ
- فطرتی جاسوس ۸ر
- ٹرکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۳ر
- بہرام چور ۱۲ر
- زرپرست ۱۲ر
- کنجی کا راز عا
- عبدالرحمن ناصر عہ
- عروس مصر عا
- سیلاب خون ۸ر
- سیاحت زمین ۱۲ر
- سیاحت ہوا عہ
- نازنین مراکش ۸ر
- سمندر کی سیر ۸ر
- اسرار بالشویزم ۱۲ر
- روح بسمل ۸ر
- امین بیگ ۱۲ر
- حجاج بن یوسف ۴ر
- یوسف پاشا ۸ر
- انقلاب عثمانی ۴ر
- بہرام کی رہائی ۴ر
- بہرام کی آزادی ۱۲ر
- بہرام کی سرگذشت ۴ر

مرافی

- مرافی دبیر ۸ر
- مرافی انیس کامل ۸ر
- مرافی ضمیر عہ
- مرافی مونس ۱۲ر
- مرافی دلگیر ۱۲ر

عجائب و غرائب

- عجائب مخلوقات تصویر رنگین ۱۲ر
- بلا تصویر سادہ للعہ
- مجمع الفنون ۸ر
- طلسم فرنگ عا
- کارخانۂ عالم عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الہ دین دہلی ۸ر
- فریب حسن ۴ر
- سوزش عشق ۸ر
- روزالیمبرٹ ۸ر
- ناول اسرار ۸ر
- شام جوانی ۴ر
- حرم سرا ۴ر

ناول سجاد حسین

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایاپلٹ ۸ر
- مٹھی چمپی ۹ر
- طرح دار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱۲ر

ناول جوالا پرشاد

- مزالنی ۱۰ر
- مار آستین ۱۰ر
- بنگالی دوشیزہ ۱۲ر
- معشوقہ فرنگ ۸ر
- پرتاب ۱۲ر
- رودھنی ۱۰ر

ناول سرشار

- سیر کہسار ۸ر
- خدائی فوجدار ۸ر
- جام سرشار ۸ر
- الف لیلہ بعجز ناول عہ
- کامنی ۸ر
- سوانح عمر دھیار ۸ر

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کنبہ ۹ر
- نیلی چھتری ۴ر
- بہرام کی گرفتاری عہ

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب ۴ر
- بزم خیال عہ
- مشاطۂ سخن عہ
- مکاتیب محسن الملک ۸ر

تذکرۃ الشعراء

- تذکرہ حسینی ۱۲ر
- گلشن بیخار ۱۰ر
- سراپائے سخن عہ
- سوانح نظیر اکبرآبادی عا

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول عہ
- " " دوم للعہ
- " " سوم ۴ر
- الفاروق ۴ر
- الغزالی ۸ر
- المامون ۸ر
- رسائل شبلی ۸ر
- موازنہ انیس و دبیر ۴ر
- کلام شبلی اردو ۴ر
- الکلام ۸ر
- علم الکلام ۸ر
- شعر العجم جلد اول ۱۲ر
- " دوم ۱۲ر
- " سوم ۱۲ر
- " چہارم ۱۲ر
- " پنجم ۱۲ر

چودھری نذیر حسین ایجنسی لکھنؤ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعہ گلشن اپرائی پریس لکھنؤ بانتظام نذیر حسین ایجنٹ نگار بک ایجنسی